

# حُسنِ کبریا کا نقوشِ تاملیہ

پرویز

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) - ۲۵/ری، گلگٹ لائبریری

## جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	-----	حسن کردار کا نقش تابندہ
مصنف	-----	علامہ پرویز
پبلشر	-----	طلوع اسلام ٹرسٹ 25 بی گلبرگ 2 لاہور
طابع	-----	دوست ایسوسی ایشن
مطبع	-----	عصمت اسلم پرنٹرز
ایڈیشن	-----	اول - جون 1981
		دوم - جون 1995

کتابیں ملنے کے پتے

طلوع اسلام ٹرسٹ

25 بی گلبرگ II لاہور - 54660 پاکستان

فون: 879246 فیکس: 876219

- ۳ ● حُسنِ کردار کا نقشِ تابندہ!
- ۴۴ ● کیا قائدِ اعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
- ۷۵ ● دو قومی نظریہ، اقبال اور قائدِ اعظم کی نگاہوں میں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے؟

## حُسنِ کردار کا نقشِ تابندہ

(قائدِ اعظم محمد علی جناح)

کہا جاتا ہے کہ بعض حقیقتیں افسانوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور بعید از قیاس ہوتی ہیں۔ اس کی تین مثال خود ہماری اپنی داستان ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ ایک قوم اپنے سامنے ایک بلند و بالا 'متعین' واضح اور روشن نصب العین رکھتی ہے۔ اس حصول کے لئے دس سال تک مسلسل مصروفِ تگ و تاز رہتی ہے۔ اس جدوجہد میں ساری دنیا سے لڑائی مول لیتی ہے۔ جانکاہ مشقتیں برداشت کرتی ہے۔ صبر آزا مصائب جھیلتی ہے۔ لیکن جب دس سال کی اس مسلسل جدوجہد کے بعد وہ نصب العین حاصل ہو جاتا ہے تو سوچنے بیٹھتی ہے کہ ہم نے اس کا مطالبہ کیوں کیا تھا؟ اس سے مقصود کیا تھا؟ اس کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ ان سوالات کے ابھارنے والوں میں بعض ایسی شخصیتیں بھی تھیں جو اس جنگ میں خود شریک تھیں۔ ان میں سے کوئی کہتا کہ دراصل ہندوؤں کی تنگ نظری نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ ہم ان سے الگ ہو جائیں۔

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا سخت پرستوں نے

بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

یعنی بقول ان کے، اگر ہندو ذرا بھی کشادہ ظرف ہوتا تو ہم کبھی ہندوستان سے الگ نہ ہوتے۔ بالفاظِ دیگر اگر وہ آج بھی ذرا وسعتِ قلبی کا ثبوت دیں تو ہم ان سے فوراً گلے مل جائیں۔ دوسری طرف سے یہ

آواز اٹھتی کہ مسئلہ دراصل معاشی تھا۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے ہمارے لئے اس کی گنجائش ہی نہ تھی ہم بڑے بڑے کارخانے لگاتے، عظیم القدر ایوانات تجارت قائم کرتے، بڑی بڑی جائیدادیں کھری کرتے۔ ہم نے پاکستان اسی مقصد کے لئے حاصل کیا تھا یعنی (بقول ان کے) یہ چند سرمایہ داروں اور زرپرستوں کی اسکیم تھی جس کے لئے قوم نے ایسی مہیب جنگ لڑی تھی بعض ایک قدم آگے بڑھے اور یہاں تک کہنے میں بھی نہ کوئی باک سمجھانہ شرم محسوس کی کہ تقسیم ہندو درحقیقت انگریزوں کی اسکیم تھی اور قائد اعظم ان کا آلہ کار تھا۔

## حصولِ پاکستان کا مقصد

حصولِ پاکستان سے مقصود کیا تھا۔ اس کے متعلق میں نے اپنے اُس مقالہ میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے جس کا عنوان ہے 'کیا قائد اعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟' اور جو چند صفحات کے بعد آپ کے سامنے آئے گا۔ اس میں میں نے مستند حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی مملکت کا قیام تھا جس میں قرآنی نظام کو رائج کیا جاسکے۔ تجدیدِ یادداشت کے لئے میں یہاں قائد اعظم کے وہ چند الفاظ دہرا دینا کافی سمجھتا ہوں جو انہوں نے ۱۹۴۴ء میں مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) میں ارشاد فرمائے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ

”آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جو انہوں نے تقسیم ہند کے مطالبہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔“

(قائد اعظم کا پیغام مرتبہ سید قاسم محمود، صفحہ ۵۲)

جو لوگ تقسیم ہند کو انگریزوں کی سکیم قرار دیتے ہیں اور قائد اعظم کو ان کا آلہ کار ٹھہراتے ہیں ان کے خبیث باطن کے علاوہ اس کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اس جنگ میں ایک طرف انگریزوں جیسی قوم تھی جس کی سلطنت پر (اس کے زمانے میں) سورج تک غروب نہیں ہوا کرتا تھا۔ دوسری طرف ہندو تھا جس کے پاس برلاؤں اور ٹائٹاؤں کی تجوریاں تھیں جن سنگھ اور راشٹرپتھ سیوک سنگھ جیسی زمین دوز و مہشت پسند تنظیمات تھیں۔ ان کے مقابلے میں ایک خیف و زار سن رسیدہ شخصیت تھی جس کے

پاس نہ دولت کے خزانے تھے نہ لاؤشکر نہ خفیہ تنظیمیں تھیں نہ پوشیدہ اسلحہ وہ تنہا بے سازو  
یراق یہ چومکھی لڑائی لڑ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک ہی قوت تھی اور وہ تھی عظمتِ کردار کی بے پناہ طاقت۔  
اسی کوشتہ آن کی اصطلاح میں ایمان کی قوت کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقین محکم  
اور اس کے حصول کے لئے پاکیزہ عمل پیہم۔ چونکہ آج ہماری قوم بد قسمتی سے اس تصویر ہی سے بیگانہ ہو چکی  
ہے کہ حسن کردار کی قوت کس قدر بے پناہ ہوتی ہے اور اس سے بے سازدسا ان کیسے کیسے میسر العقول  
کارنامے ظہور میں آسکتے ہیں اس لئے وہ سمجھ ہی نہیں سکتی کہ حصولِ پاکستان کاراز اس معمارِ پاکستان کے  
یقین محکم، عزم بلند اور بے لوث کردار میں مضمحل تھا۔ میں صحبتِ امروزہ میں اسی بنیادی نکتہ کی وضاحت کی  
کوشش کروں گا، بالخصوص اس اعتراض کی تردید کہ تقسیم ہند کی سیکم انگریز کے ذہن کی اختراع تھی اور  
قائد اعظم اس کے اس مقصد کے حصول کے آلہ کار تھے۔

جہاں تک کردار کی عظمت (یعنی کیریئر کی بلندی اور پاکیزگی) کا تعلق ہے اس ضمن میں ایک بنیادی  
نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے اور وہ یہ کہ نام و نمود کے خواہاں لوگ جب اپنی شہرت کے عروج پر پہنچ جائیں تو  
وہ اپنی گفتار و کردار کے بارے میں خاص احتیاط برتتے ہیں کہ ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے  
جس سے ان کی شہرت داغدار ہو جائے۔ لہذا ان کے اس زمانے کے اعمال و افعال کیریئر مانیٹنگ کا پیام  
نہیں بن سکتے۔ کیریئر مانیٹنگ کا پیمانہ کسی کے اس زمانے کے احوال و کوائف ہوتے ہیں جب اس نے ہنوز  
کوئی مقام بلند حاصل نہ کیا ہو اور وہ عام انسانوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہو۔ وہ اس زمانے میں جو کچھ کہتا اور  
کرتا ہے اس میں تصنع اور آؤرد نہیں ہوتی۔ اس لئے ان میں اس کے جوہر کردار کی حقیقی جھلک دکھائی  
دے سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضور نبی اکرم سے مخالفین نے پوچھا کہ اس کی شہادت کیا ہے کہ  
آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو آپ نے فرمایا:

فَقَدْ كَذَبْتُ فَيَكْفُرُ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰)

میں نے اعلانِ نبوت سے پہلے سب میری حیثیت معاشرہ کے ایک عام فرد کی سی تھی  
تمہارے اندر زندگی گزاری ہے۔ میرے اس زمانے کے کردار کو سامنے لاؤ اور پھر سوچو کہ  
اس قسم کا کردار ایک سچے انسان کا ہوتا ہے یا جھوٹے آدمی کا!

حضور کے اس جواب نے (جو زبانِ وحی دیا گیا تھا) ہمارے سامنے کردار کے ماننے کا صحیح پیمانہ رکھ دیا

ہے۔ میں اسی پیمانے کے مطابق قائد اعظم کے کردار کی داستان، ان کی زندگی کے اس ابتدائی دور کے شروع کروں گا جب انہیں ہنوز ملک گیر شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ آغازِ سخن ۱۹۱۸ء سے کیا جاتا ہے۔ جب مانٹیگو چمفسور ڈسکیم کے سلسلہ میں اس زمانے کے وزیر ہند مسٹر مانٹیگو کو ہندوستان آئے۔ انہوں نے اس وقت کے چوٹی کے لیڈروں، تلک، گوکھلے، وادابھائی نوروجی کے علاوہ مسٹر محمد علی جناح سے بھی ملاقات کی اور اپنی ڈائری میں اس جوان سال سیاستدان کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلم بند کئے۔

ایک صاف ستھرا انتہائی باسیلقہ نوجوان جس کی چال ڈھال دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ گفتگو میں منطقی داؤ پیچ کا زبردست ماہر۔ اپنی بات کو سولہ آنے منوانے کا مدعی۔ وہ اپنی رائے میں کسی ترمیم کا روادار نہیں۔ اگر اس کی پوری بات نہ مانی جائے تو آدمی بات ماننے پر کبھی راضی نہیں ہوگا۔ میں اس سے باتیں کر کے ہار گیا۔ لارڈ چمفسور نے اس سے بحث کرنے کی کوشش کی، لیکن جناح کی قوت استدلال نے اسے پوری طرح ابھرا کر چاروں شانے چت کر دیا۔ وہ ایک انتہائی ذہین شخصیت کا مالک ہے۔ اس سے بڑھ کر حقوق کی پامالی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جناح جیسے انسان کو کبھی نظام مملکت میں دخل حاصل نہ ہو۔

لندن سے دبیر سٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد مسٹر جناح نے بمبئی میں پریکٹس شروع کی تو حالات سخت نامساعد تھے اور زمانہ انتہائی مشکلات کا لیکن اس پر بھی بساطِ روزگار پر اس نوجوان کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ عدلیہ کے سربراہ سر چارلس اولیونٹ نے انہیں پریزیڈنسی مجسٹریٹ کے ممتاز منصب کی پیشکش کی جس کا مشاہرہ اس زمانے میں پندرہ سو روپے تھا تو مسٹر جناح نے اس پیشکش کو شکر یہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ میں کم از کم پندرہ سو روپے روزانہ کمانے کا پروگرام بنا چکا ہوں۔ سر چارلس اسے ایک مجذوب کی بڑے قرار دے کر مسکرا دیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس نے دیکھ لیا کہ یہ مجذوب کی بڑ نہیں تھی۔ ایک بخود گزیدہ نوجوان کی خود اعتمادی کا مظاہرہ تھا جو حقیقت بن کر رہا۔

یہ پہلی جنگِ عظیم کے آخری دور کی بات ہے۔ اس جنگ میں گواٹھادیوں کو بہیئت مجموعی کامیابی

حاصل ہو رہی تھی لیکن ان جراحات ہائے سپہم سے برطانیہ کی حالت سہل کی سی ہو رہی تھی اور حکومت اس قدر ذکی الحس ہو گئی تھی کہ وہ اپنے خلاف ذرا سی تنقید بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ لارڈ ہارڈنگ برطانوی پارلیمنٹ میں یہ کہہ بیٹھا کہ ہم انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کو دعوت دیتے ہیں کہ حکومت ہند کے خلاف آزادانہ تنقید کریں۔ جناح کو ایسا موقع خدا دے۔ وہ اس زمانے میں مسز اینی بسنٹ کی قائم کردہ 'ہوم رول لیگ' کے سرگرم رکن تھے۔ انہوں نے اس کے پلیٹ فارم سے جوابی تقریر کی جس میں پہلے اہل ہند کی ان بے مثال قربانیوں کا ذکر کیا جو انہوں نے جنگ کے سلسلہ میں دی تھیں۔ اس کے بعد کہا:-

ان قربانیوں کے باوجود ہندوستانیوں سے کیا سلوک روار کھا جا رہا ہے؟ باوجود اتنا خون بہانے کے ہندوستان کو اس کی قیمت کیا مل رہی ہے؟ کیا ان قربانیوں کا یہی صلہ ہے کہ آزادی کے علمبردار جیلوں میں بند کئے جا رہے ہیں! آخر قربانیوں کا زبانی اعتراف کر لینے سے کیا ہوتا ہے..... یہ جنگ آزادی اور استقلال کی بقا کے لئے لڑی گئی تھی۔ کیا دفتر ہی حکومت اندھی تھی؟ کیا ارباب حکومت فاترالعقل تھے جو جنگ جیتنے کے بعد ہندوستانیوں سے ایسا سلوک روار کھنے پر اتر آئے! یاد رکھئے کہ یہ انداز حکومت کے ذہنی اور سیاسی افلاس کا نشان ہے۔

مسٹر جناح کے اس نعرہ حریت کا اثر تھا کہ وزیر ہند کو دارالعوام میں اعلان کرنا پڑا کہ ملک معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو معاملات میں زیادہ سے زیادہ مواقع دیتے جائیں اور رفتہ رفتہ حکومت برطانیہ کے اس حقے میں سیلف گورنمنٹ کی بنیاد رکھی جائے۔

یہ آزادی ہند کی عمارت کی پہلی اینٹ تھی جو قائد اعظم محمد علی جناح کے ہاتھ سے رکھی گئی۔ وزیر ہند نے تو حکومت برطانیہ کی اس پالیسی کا اعلان کر دیا لیکن ہندوستان میں ایسے سر پھرے انگریز حکمران تھے جو نشہ حکومت میں بدست اس تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اہل ہند کو کچھ سیاسی اختیارات حاصل ہو جائیں۔ ان میں لارڈ سیدنہم اور لارڈ ولنگٹن کا نام سرفہرست آتا تھا جو یکے بعد دیگرے اس صوبہ بمبئی کے گورنر مقرر ہوئے جو جناح کا مسکن تھا۔ جناح نے ان دونوں سے جس



بے باکانہ انداز سے ٹکرتی۔ وہ ہندوستانی سیاست کی تاریخ کا ولولہ انگیز باب ہے۔

لارڈ سید نہم نے اہل ہند کے خلاف کچھ تحقیر آمیز الفاظ کہے تو یہ سرسرت بادۂ حریت پھیرے ہوئے شیر کی طرح ہوم رول لیگ کے پیٹ فارم سے گرجا اور لارڈ سید نہم کا نام لے کر کہا کہ یہی ہے وہ رجعت پسند جس نے ایک عرصہ تک ہندوستان کے خزانے سے بیش بہا تنخواہیں وصول کیں اور اب یہ ایسی سازشوں کی رہنمائی کر رہا ہے جو کسی شریف انسان کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتیں۔ میں اس کی ساری بھواس کا یہی جواب دے سکتا ہوں کہ جب یہاں کے عوام حق خود اختیاری کے قابل ہو جائیں گے تو وہ اس کے پاس اس حق کے لئے بھیک مانگنے نہیں جائیں گے۔

اُس دور میں جرأت و بے باکی کی اس قسم کی مثال بہت کم ملے گی۔ اس کے بعد لارڈ وٹنگٹن کی باری آئی۔ اس جابر حکمران نے مسلم لیگ کے اجلاس کو ناکام بنانے کی نہایت مکروہ سازش کی تھی اور جناح کو اس کا علم تھا۔ جب وہ ہندوستان سے رخصت ہونے لگا تو خوشامد پسندوں کے ایک گروہ نے ٹاؤن ہال میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا جس میں ابا لیاں شہر کی طرف سے اس کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرنے کا پروگرام تھا۔ مسٹر جناح انتہائی جرأت و بسالت سے اس جلسہ میں جا پہنچے، لیکن پولیس نے انہیں وہاں سے نکال دیا۔ وہ ہال سے باہر آئے تو وہاں ہزاروں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ مسٹر جناح نے وہاں جو شعلہ انگیز تقریر کی اس نے فضا میں ایسا تہلکہ مچا دیا کہ ٹاؤن ہال کا جلسہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اس بے مثال کامیابی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے سامعین سے کہا کہ

آپ نے آج جمہوریت کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ آج آپ نے دنیا پر واضح کر دیا کہ نوکر شاہی اور مطلق العنانی دونوں مل کر بھی آپ کو خوفزدہ نہیں کر سکتیں۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۷ء کا یہ دن، بستی کی تاریخ میں جشنِ سرسرت کا دن ہے۔ جاتیے اور خوشیاں منائیے۔ آج جمہوریت کی فتح اور سر بلندی کا دن ہے۔

اہل بستی نے یہ جشن اس انداز سے منایا کہ وہاں جناح میموریل ہال کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ جو آج تک اس بطلِ حریت کے جذبہ بیباکی کی یاد تازہ کرنے کا محسوس محرک ہے۔ اس میموریل کے قیام کے سلسلہ میں ایک ہندو لیڈر مسٹر پی۔ ڈی۔ لام نے جو اپیل شائع کی تھی اس کے یہ الفاظ ایک درخشندہ حقیقت کے

آئینہ دار ہیں۔ اس نے کہا تھا:

کوئی شخص اگر "میموریل" کا مستحق ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں جن کی بلند حوصلگی اور بے خوف قیادت نے قومی زندگی میں حقیقتاً ایک نئے دور کا آغاز کر دیا ہے۔ مسٹر جناح کے عزیز صمیم ہیں ہمارے مرحوم بیٹروں دادا ابھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے..... انہوں نے عوام کے حقوق کی راہنمائی کی ہے اور ایک عظیم المرتبت محبت وطن کی حیثیت سے ان کا نام ہمیشہ ہمارے دلوں میں تروتازہ رہے گا..... مسٹر جناح ہر اعتبار سے ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور ایک میموریل کے

بجا طور پر مستحق ہیں!

یہ واقعہ ٹولارڈ و لنگڈن کے رخصت کے وقت کا ہے۔ اس کے دور حکومت میں بھی مسٹر جناح نے اس کے ہر غلط اقدام کی اس شدت اور سختی سے مخالفت کی جس کی اس زمانے میں شاید ہی کوئی اور جرأت کر سکتا تھا جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، وہ زمانہ جنگ کا تھا جس میں انگریز اپنے خلاف خفیف سے خفیف تنقیدی آواز کو بھی استبداد کے آہنی شکنجہ سے دبا دینے پر تیار بیٹھا تھا۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ لارڈ و لنگڈن نے صوبائی وار کانفرنس کا اجلاس طلب کیا جس میں مسٹر جناح کو بھی، ہوم رول لیگ کے نمائندہ کی حیثیت سے مدعو کیا، لارڈ و لنگڈن نے اپنے ایڈریس میں اہل ہند سے جنگ میں عملی تعاون کی اپیل کی لیکن اس کے ساتھ ہی ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کی نیت پر حملہ بھی کر دیا۔ اس کے ایڈریس کے فوری بعد مسٹر جناح اسٹیج پر آئے اور اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

مرحلہ کتنا ہی نازک کیوں نہ ہو ہر ہندوستانی اس پر متفق ہے کہ ہندوستان کو سیاسی میدان میں آگے بڑھنا چاہیے۔ قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں اس قلبی اذیت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ ہز ایکسپینسی ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کے خلوص و صداقت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اس طرزِ کلام اور روش پر انتہائی افسوس ہے اور ایکسپینسی کے احترام کے باوجود میں اس طرزِ عمل کے خلاف اظہارِ احتجاج کرتا ہوں۔ ہم اپنے ملک کے دفاع کے لئے بے چین ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ حکومت سپاہیوں کی بھرتی چاہتی ہے اور ہم "نیشنل آرمی" کا قیام چاہتے ہیں۔ یہی فرق ہے

ہم دونوں ہیں۔ ہمارے نزدیک "جرمن خطرہ" سپاہی دور نہیں کر سکتے۔ یہ صرف نیشنل آرمی کر سکتی ہے۔ ہم اس وقت تک حکومت کی کوئی مدد نہیں کر سکتے جب تک ہمیں اعتماد میں نہ لیا جائے اور شریکِ کار نہ بنایا جائے۔

مسٹر جناح تو ان جذبات کا اظہار کر رہے تھے اور دوسری طرف مسٹر گاندھی جنہیں آزادی کا اوتار کہہ کر پکارا جاتا ہے، کی کیفیت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے ایک انگریز دوست کی معرفت، واٹس رائے کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا کہ

میں اپنے ملک والوں کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ تخریبِ آزادی کے سلسلہ میں اپنے بڑھے ہوئے قدم پیچھے ہٹالیں۔ میں کانگریس کے تمام ریزولوشنز واپس لینے کا مشورہ دوں گا اور دورانِ جنگ ہوم رول یا ذمہ دار حکومت کا نام بھی نہ لوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ مادریہ ہند کا ہر تندرست سپوت سلطنت کی حرمت پر کٹ مرے۔

مسٹر جناح نے حکومتِ برطانیہ کی اس پالیسی کے خلاف، صرف وار کونسل کی اس کانفرنس میں تقریر نہیں کی وہ مختلف مواقع پر اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہے اور آخر کار انہوں نے وار کونسل سے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ یہ استعفیٰ جس خط کے ساتھ بھیجا گیا وہ ہندوستان کی تاریخِ آزادی میں منفرد دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ

حکومتِ ہند نے اور آپ نے زمانہ امن میں ایک ایسی چیز کو رجسٹر قوانین میں شامل کرنا مناسب سمجھا ہے جو حقیقتاً لفریت انگیز اور بلاخوب تردید تشدد آمیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بل پاس کر کے آپ کی حکومت نے اس تمام استدلال پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے جو جنگی کانفرنس میں مدد کے لئے ہندوستانیوں سے اپیل کرتے وقت پیش کیا گیا تھا۔ آپ نے ان تمام اصولوں کو پاؤں تلے روند دیا ہے جن کے لئے حکومتِ برطانیہ نے جنگ لڑی تھی۔ انصاف کے بنیادی اصولوں کا عین اس وقت استیصال

کیا گیا ہے اور عوام کے آئینی حقوق پر عین اس وقت ڈاکہ ڈالا گیا ہے جب حکومت کو حقیقتاً کسی بھی خطرے کا سامنا نہیں۔ ان حالات کے تحت میں اپنے رائے دہندگان کے لئے کونسل میں ایک عضوِ معطل کی حیثیت رکھتا ہوں۔ علاوہ ازیں ایک ایسے شخص

کے لئے جو عزتِ نفس کا احساس رکھتا ہو، ایک ایسی حکومت کے ساتھ جو عوام کے نمائندوں کی رائے کو نہ تو کونسل میں کوئی اہمیت دیتی ہو اور نہ ہی اسے عوام کے جذبات کا کوئی احترام ملحوظ ہو تعاون کرنا امرِ محال ہے۔ میری رائے میں ایک ایسی حکومت جو زمانہ امن میں ایسے قوانین پاس کرتی ہے، ہند ب حکومت کہلانے کی مستحق نہیں۔

جنگ کے خاتمہ پر حکومتِ برطانیہ نے اہل ہند کے تعاون کا صلہ اس رسوائے زمانہ رولٹ ایکٹ کی شکل میں دیا جس کی رُو سے امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ہزاروں مجبوس انسانوں کا قتل، ہلاک اور چنگیز کی وحشت انگیزیوں اور خونریزیوں کی داستانوں کو فراموش کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس قیامت خیز المیہ کے متعلق بیان دیتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا:

رسوائے عالم رولٹ کمیٹی کے "سٹارچیمبر" میں وضع کئے ہوئے قوانین جن پر لارڈ چیمفورڈ کی حکومت نے عمل درآمد شروع کیا ہے، ایسے ہیبت ناک جرائم پر منتج ہوتے ہیں جن کو نہ تو کوئی آدمی بیان کر سکتا ہے اور نہ عورتوں کے اشکوں کی روانی دھون سکتی ہے۔ انہیں اپنے اس فیصلے کی قیمت آج نہیں توکل ضرور ادا کرنی پڑے گی۔ کم از کم ایک بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ موجودہ طرزِ حکومت ناقابلِ برداشت ہے اور اس کی جگہ ایک مکمل ذمہ دار حکومت ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں کانگریس اور لیگ کے اجلاس زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوں گے۔ سیکرٹری آف اسٹیٹ کو احتجاجی ریزولوشن بھیجنے کے بجائے کوئی مؤثر لائحہ عمل وضع کرنا ہوگا۔ یقیناً ہمیں وہی ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے جو فرانس، اٹلی اور مصر میں برٹے کاروائے کئے ہیں۔

اسی قسم کے تھے مسٹر جناح کے جذبات تہور اور آزادی کے وہ مظاہر جن سے متاثر ہو کر مسٹر گوگلے جیسے عظیم ہندو راہنما نے کہا تھا کہ

ہندوستان کو جب بھی آزادی نصیب ہوئی، وہ جناح ہی کی بدولت ہوگی۔

مسٹر جناح کے اس بے لوث کردار کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں ان کا کس قدر احترام تھا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگ سکتا ہے۔ وہ کانگریس سے الگ ہو چکے تھے اور اس کے مسلک کے خلاف تھے۔

اس دوران میں، وہ مرکزی کونسل کی رکنیت کے لئے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔ ان کا  
بد مقابل کانگریس کا امیدوار تھا۔ "بہت سی گرائیکل" چوٹی کا فیشنل روزنامہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے  
ووٹروں سے مسٹر جناح کے حق میں اپیل کی اور کہا کہ

ان کی گزشتہ عظیم الشان خدمات اچھی حیت الوطنی اور جذبہ حریت ایسی صفات ہیں  
جو نہ تو کسی سفارشات کی محتاج ہیں اور نہ کوئی شخص ان کی عظمت کو کم کرنے کی جرات  
کر سکتا ہے۔ علاوہ بریں جناح کے ناقابل تسخیر جذبہ جہاد نے باقی شہریوں کے مقابلہ  
میں انہیں بہت بڑا امتیازی مقام عطا کر دیا ہے۔ اگر معمولی اختلاف کی بنا پر جناح  
جیسے قائد کو ملکی خدمات اور قومی جدوجہد کے اس منصب سے محروم کر دیا گیا تو یہ ایک  
ناقابل فراموش ذلت کا ارتکاب ہوگا۔

قائد اعظم نے کوئی انتخابی ہم شروع نہ کی لیکن ان کے ہندو دوستوں نے از خود قریب ایک سو موٹریں فراہم  
کر دیں اور وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔

اس وقت تک ہم مسٹر جناح کی زندگی کے اس حصہ سے متعلق گفتگو کر رہے تھے جب وہ ہندوستان  
کی عمومی سیاست کے لیڈر تھے۔ اب ہم اس وادی میں داخل ہوتے ہیں جہاں وہ ملت اسلامیہ  
کے قائد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس ضمن میں سر آغاز داستان اتنا واضح کر دینا ضروری ہے  
کہ سیاست عالم کا موجودہ دور میکیاولی کہلاتا ہے جس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ مقصد کے حصول کے لئے  
ہر قسم کا حربہ استعمال کرنا جائز ہے۔ لہذا اس سیاست میں جھوٹ، فریب، مکاری، عیاری، وعدہ فراموشی،  
پیمان شکنی وغیرہ سب جائز قرار پاتے ہیں۔ جو جس قدر شاطر اور چال باز ہو، وہ اسی قدر کامیاب اور نامور  
لیڈر مانا جاتا ہے اور قوم اس کے مجتہدے نصب کرتی ہے۔ اس دادی پر خار میں قائد اعظم کے بد مقابل انگریز،  
ہندو اور تحریک پاکستان کے مخالف مسلمان سب "متحدہ محاذ" بنائے ہوئے تھے۔ میکیاولی سیاست  
میں انگریز تو استاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن ہندو اور (نام نہاد) مسلمان سیاسی لیڈر بھی اس باب  
میں اس سے پیچھے نہ تھے۔ مسٹر سری پرکاش، ۱۹۳۸ء میں پاکستان میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ انہوں نے  
۱۳ نومبر کی شام، کراچی میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا :-

کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے، لیکن یہ حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کرنا چاہیے کہ ہندومت میں کوئی اصول زندگی قطعی اور ابدی نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندومت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقع پر دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا۔ اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن عمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندومت ہزاروں سال مختلف حالات اور مہاتماں ماحول میں زندہ رہا اور زندہ رہے گا۔

اس ہندومت کا سب سے بڑا نمائندہ مسٹر گاندھی تھا جسے اس کی قوم "ہاتما" کہتی اور ایشور کا اوتار مانتی تھی۔ اس "ہاتما" کے متعلق قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ

ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے جب ان کے مفید مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے داعی نمائندہ بن جاتے ہیں۔ ان کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن برت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل نہیں بن پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں۔ کہتے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیتان ہیں، مہتمہ ہیں۔

بہر حال یہ تھے وہ حریف جن سے قائد اعظم کو واسطہ پڑا تھا۔ ان کا یہ دس سالہ دور سیاست بھی ساری دنیا کے سامنے ہے۔ اپنے تو ایک طرف، ان کے کسی بد سے بدتر دشمن کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ انہوں نے کسی معاملہ میں جھوٹ بولا یا فریب دیا ہو، وعدہ خلافی کی ہو یا بات کر کے مکر گئے ہوں۔ صاف 'سیدھی' دو ٹوک بات اور پھر اس پر چٹان کی طرح قائم یہی تھی ان کی وہ خصوصیت گہری جس پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے دنیا کے مشہور ترین اخبار - لندن ٹائمز - نے ان کی وفات پر لکھا تھا کہ

انہوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات میرے کی طرح قیمتی مگر سحت و

واضح ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی جیلہ سازی نہ تھی بلکہ وہ جس نقطہ نظر کو ہدف بناتے تھے اس پر براہ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابل تسخیر حریف تھے۔

## دیانتدارانہ سیاست

لندن ٹائمز کے ان ریمارکس کی تائید میں قائد اعظم کی زندگی کے بے شمار واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن میں یہاں صرف دو ایک پر اکتفا کروں گا۔ مسٹر اصفہانی نے اپنی کتاب QUADI-E-AZAM JINNAH میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے کلکتہ کے مسلم چیمبر آف کامرس کی ایک نشست خالی ہوئی، اس کیلئے مسٹر اصفہانی بطور مسلم لیگی امیدوار کھڑے ہوئے۔ انتخاب بلا مقابلہ ہو رہا تھا کہ تاریخ نامزدگی سے دو دن پہلے بالکل خلافتِ توقع، ایک اور صاحب نے اپنے کاغذاتِ نامزدگی داخل کر دیئے۔ اس زمانے میں انتخاب کے معنی محض ایک آدھ نشست حاصل کر لینا نہیں تھا۔ اس سے مسلم لیگ کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کے دعویٰ کا ثبوت بہم پہنچتا تھا۔ اس لحاظ سے فریقِ مقابل کا یوں سامنے آجانا وجہ پریشانی ہو گیا۔ ایک شام (مرحوم) عبدالرحمان صدیقی بھاگے بھاگے آئے اور اصفہانی صاحب کو یہ مشورہ سنایا کہ انہوں نے فریقِ مخالف کو اس پر رضامند کر لیا ہے کہ اگر ہم اس کے زیر ضمانت کا مبلغ اڑھائی سو روپیہ ادا کر دیں تو وہ مقابلہ سے دستبردار ہو جائے گا۔ ہم اس سے بہت خوش ہوئے، قائد اعظم ہم سے ذرا فاصلے پر بیٹھے تھے۔ ان کے کان میں بھنگ سی پڑی تو انہوں نے صدیقی صاحب سے کہا کہ ذرا اپنی بات کو دہرائیں۔ انہوں نے بات سنائی تو قائد اعظم نے سخت برا فرود ختم ہو کر کہا کہ تم نے کیا کہا ہے؟ پیسے دے کر فریقِ مخالف کو بھٹا دینا! یہ بالواسطہ رشوت نہیں تو اور کیا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ جاؤ! اور اس سے کہو کہ ہمیں یہ منظور نہیں۔ ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔

اس کے ساتھ ہی قائد اعظم نے جو اصول بیان فرمایا وہ سننے کے قابل ہے۔ دورِ حاضرہ کی میکیاولی سیاست میں اخلاق کے دو ضابطے ہیں۔ پرائیویٹ زندگی کے لئے اور ضابطہ۔ پبلک زندگی کے لئے اور پرفیسر جوڈ کے الفاظ میں :-

(دورِ حاضرہ کی سیاست میں) پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امورِ مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانتدارِ رحمِ دل اور قابلِ اعتماد ہیں۔ ان کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے نمائندوں سے معاملہ کرنا ہو تو وہاں وہ سب کچھ کر گزرنا "کارِ ثواب" سمجھیں گے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں نہایت شرمناک تصور کرتے تھے۔

GUIDE TO MORALS, P-130

اور اسی بنا پر اٹلی کے مشہور مدبر CAVOUR نے کہا تھا کہ اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم بڑے بڑے شیطان کہلائیں۔ (انسان نے کیا سوچا؟ ص ۲۳۵)

قائد اعظم بھی اسی دور کے سیاستدان تھے اور ان کے فریقِ مقابل بھی اسی سیاست کی بساط بچھاتے ہوئے تھے۔ لیکن دیکھئے کہ ان کے اصولِ سیاست کیا تھے۔ انہوں نے مسٹر اصفہانی سے کہا: "میرے عزیز یاد رکھو! بلکہ زندگی میں اخلاقی دیانت پرائیویٹ زندگی سے بھی زیادہ اہم ہے۔ پرائیویٹ زندگی میں بددیانتی سے کسی ایک شخص کو نقصان پہنچتا ہے، لیکن بلکہ زندگی میں بددیانتی سے لاتعداد لوگ مجروح ہوتے ہیں اور اس سے ہزار ہا ایسے لوگ بے راہرہ ہو جاتے ہیں جن کا آپ پر اعتماد ہوتا ہے۔" مسٹر اصفہانی لکھتے ہیں کہ قائد اعظم کہا کرتے تھے کہ جو لوگ میری دیانت داری کی تعریف کرتے ہیں وہ کسی طور پر بھی عزت افزائی نہیں کرتے۔ دیانت دار ہونا انسانیت کا تقاضا ہے اور انسانی تقاضے کو پورا کرنے پر تعریف کیسی؟ بالفاظِ دیگر جو دیانت دار نہیں، وہ انسان ہی نہیں۔

کلکتہ کے انتخاب سے کہیں زیادہ اہم ایک اور انتخابی مہم درپیش تھی۔ ۱۹۴۶ء۔ ۴۷ء میں مسلم لیگ وزارت میں قائم کرنے کا سوال درپیش تھا۔ ۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو پنجاب میں خضر حیات خاں کی وزارت نے استعفیٰ دیا تو گورنر نے نواب ممدوٹ سے تشکیلی وزارت کے لئے کہا۔ عدوی اعتبار سے یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ مسلم لیگ اپنے ساتھ کچھ غیر مسلم اراکین کو ملا کر وزارت قائم کرتی۔ قائد اعظم کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی گئی اور ان سے کہا گیا کہ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس وقت ایسا کر لیں اور جب



آہستہ آہستہ مسلم لیگ طاقت پکڑ جائے تو پھر ان دوسرے ممبروں سے نیٹ لیا جائے۔ قائد اعظم اس پر سخت برا فروختہ ہوئے اور تجویز پیش کرنے والے سے کہا کہ

آپ کان کھول کر سن لیجئے کہ میں اس قسم کی سیاسی چال بازیوں اور مصلحت انگیزیوں سے کبھی کام نہیں لینا چاہتا۔ میری سیاست ان سے بہت دور ہے۔ تم غیر مسلم ممبر کہتے ہو۔ میں تو غیر لیگی ممبروں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر کے کابینہ بنانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ دو قومی نظریہ کے خلاف ہو گا اور یہی نظریہ مطالبہ پاکستان کی بنیاد ہے۔

اس پر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ نواب ممدوٹ نے وزارت متشکل کرنے سے انکار کر دیا اور گورنر نے پنجاب میں آرٹیکل ۹۳ نافذ کر دی۔ چند ہی مہینوں کے بعد پاکستان وجود میں آ گیا اور نواب ممدوٹ نے پہلی لیگی وزارت قائم کر لی۔ (ماہنامہ المعارف لاہور، بابت نومبر و دسمبر ۱۹۷۶ء، حصہ انگریزی ص ۳۷)

## مسلم لیگ فنڈ

ابھی ابھی ہم نے دیکھا ہے کہ قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ جو شخص دیانت دار نہیں وہ انسان ہی نہیں۔

لے لوئے وقت کی اشاعت بابت ۲۴ جنوری ۱۹۸۱ء میں ایک صاحب کا خط چھپا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ممدوٹ وزارت کا قصہ اس طرح نہیں تھا جس طرح المعارف میں لکھا گیا ہے۔ المعارف کے واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ چیف جسٹس (ریٹائرڈ) محمد منیر صاحب نے ۲۳ مارچ ۱۹۷۶ء کو پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد شدہ قائد اعظم سیمینار میں ایک مقالہ پڑھا تھا جس میں قائد اعظم کی اصول پرستی کی تائید میں یہ واقعہ درج کیا تھا۔ ان کا یہ مقالہ بعد میں المعارف میں شائع ہوا تھا۔ اب اس کا فیصلہ محترم جسٹس منیر اور مراسلہ نگار ہی کر سکتے ہیں کہ کس کا بیان واقعہ کے مطابق ہے۔

جیسا کہ پریوز صاحب نے متعدد بار کہا ہے یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ اس وقت تک نہ تو تحریک پاکستان کے متعلق کوئی مستند تاریخ مرتب ہوئی ہے اور نہ ہی قائد اعظم کی کوئی قابل اعتماد سوانح حیات۔ ان حالات میں واقعات کی جزئیات میں اختلاف ممکنات میں سے ہے لیکن اصل سوال قائد اعظم کی اصول پرستی کا ہے جس کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ (طلوع اسلام)

دیانتداری کی سب سے بڑی کسوٹی روپیہ ہے۔ ہماری بڑی بڑی انجمنوں تنظیموں، جماعتوں اور معتبر شخصیتوں کی کشتی اسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے۔ قائد اعظمؒ کو اس ذمہ داری کا ایسا شدید احساس تھا کہ انہوں نے مسلم لیگ کے لئے فنڈ کی اپیل کی تو ہر روز سینکڑوں مسی آڈروں پر خود دستخط کرتے تھے۔ آپ سوچئے کہ قائد اعظمؒ جیسے مصروف اور نچیف و زار شخص کے لئے ہر روز اتنی تعداد میں مسی آڈروں پر دستخط کرنا کس قدر دود بھر تھا۔ لیکن وہ خوشی خوشی ایسا کرتے، وہ بار بار اپنی انگلیوں کو ہلاتے اور پھر دستخط کرنا شروع کر دیتے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے تو فرماتے کہ ”فنڈ کی اپیل میں نے کی ہے، لوگ میرے اعتماد پر پیسے بھیتے ہیں، مجھے ایک ایک پیسے کا حساب دینا ہوگا۔ اس لئے رسیدیں مجھے ہی دینی چاہئیں۔“

آپ اس جواب کے آخری الفاظ پر غور فرمائیے جن میں کہا گیا ہے کہ ”مجھے ایک ایک پیسے کا حساب دینا ہوگا۔“ ظاہر ہے کہ قائد اعظمؒ سے حساب مانگنے والا کون ہو سکتا تھا؟ اس لئے اس سے مطلب یہ تھا کہ مجھے ان کے پیسوں کا خدا کے ہاں حساب دینا ہوگا اور یہی ہے دیانتدار ہونے کے لئے بنیادی راز۔ جس شخص کا یہ ایمان ہو کہ مجھے ایک ایک پائی کا خدا کے ہاں حساب دینا ہوگا، وہ بد دیانت ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت عمرؓ نے خلافت کا مطلب ہی یہ بتایا تھا کہ خدا پوچھے گا کہ کہاں سے لیا تھا اور کسے دیا تھا۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ قائد اعظمؒ پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے سرکاری مکان میں رہائش پذیر ہو گئے تو ان کی یہ روش تھی کہ جس کمرے میں روشنی کی ضرورت نہ ہوتی اس کمرے کا بلب خود بجھا دیتے۔ اور مختلف کمروں میں چلتے پھرتے بلب جلانے اور بجھانے کا عمل متواتر ساتھ ساتھ چلتا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ

اسراف گناہ ہے اور اگر وہ روپیہ قوم کا ہے تو اس میں اسراف گناہِ عظیم ہے۔

(اصفہائی ۱۲۵)

یہ تھا قائد اعظمؒ کا کردار! انہوں نے مسلم لیگ کنونشن (۱۹۴۶ء) کی افتتاحی تقریر میں اس سوال کے جواب میں کہ کیریپٹر کسے کہتے ہیں، فرمایا تھا:-

عزتِ نفس، دیانت، امانت، یقینِ محکم اور قومی مفاد کی خاطر اپنے آپ کو محو کر دینے

کے لئے ہر وقت آمادگی۔ ان امتیازات کی شدت احساس کو کیریکٹر کہا جاتا ہے۔  
 یہی تھا قائد اعظم کا وہ کردارِ بلند جس کے اعتراف میں ”دی گریٹ ڈیٹا“ کے مصنف ”ایچ دی ہڈسن“  
 نے لکھا تھا کہ

قائد اعظم کے بڑے سے بڑے سیاسی حریف نے بھی کبھی ان کے خلاف بددیانتی  
 یا مفاد پرستی کا الزام عائد نہیں کیا تھا۔ انہیں کوئی شخص کسی قیمت پر بھی خرید نہیں  
 سکتا تھا۔ نہ ہی وہ مرغِ بادِ نما تھے جو شہرت عطا کرنے والی ہواؤں کے ساتھ اپنا  
 اپنا رخ کر دار بدل لیتے یا وقتی مفادات کی خاطر اپنے سیاسی اصولوں میں تبدیلی کرتے۔  
 وہ اصولوں کی پابندی میں چٹان کی طرح سخت اور بلند ترین عزتِ نفس و حمیت کے  
 پیکر تھے۔ (تخلیقِ پاکستان، انگریزی، از جمیل الدین احمد، صفحہ ۲۶۶)

علامہ اقبال کے یہ الفاظ ان پر ٹھیک ٹھیک صادق آتے ہیں ے

وہی ہے بندہٴ حُر جس کی ضربے کاری نہ وہ کہ حربے جس کی تمام عیاری  
 زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

اور اس سے ہماری نگاہ کا رخ، اقبال جیسے حکیم الامت کی نظر انتخاب کی طرف پلٹتا ہے۔ مسٹر جناح  
 ہندی سیاست کی بوا بھجیوں سے دل برداشتہ ہو کر گوشہ نشین سے ہو چکے تھے۔ دوسری طرف  
 ہندوستان میں انگریز اور ہندو کی ملی بھگت ایسے منصوبے بنا رہی تھی جس سے اس ملک میں مسلمانوں کا  
 جداگانہ تشخص تک باقی نہ رہے۔ علامہ اقبال اپنی زندگی کے آخری دور میں پہنچ چکے تھے اور مسلمانوں کے  
 مستقبل کے احساس سے وہ خون کے آنسو روتے تھے۔ انہیں مسلمان لیڈروں میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا  
 تھا جو اس قوم کی کشتی کو ان طوفانوں سے بچا کر سلامتی کے ساحل کی طرف لے جائے۔ لیکن اقبال تو  
 دیدہ ورن تھا۔ اس لئے اس کی نگاہ سطح سے نیچے اتر کر گہرائیوں تک جا پہنچی اور وہاں سے اسے وہ گہر  
 تا بہر مل گیا جس کی تلاش میں وہ سرگرداں پھر رہا تھا۔ انہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو محمد علی جناح کو  
 ایک خط لکھا جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر حیاتِ قائد اعظم کے احوال و  
 کوائف کے متعلق کوئی اور دستاویز باقی نہ بھی رہے تو صرف یہ ایک خط ان کی عظمتِ کردار اور ہندی مقام  
 کی مین شہادت قرار پانے کے لئے کافی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اقبال نے اپنے اس خط میں لکھا تھا:-

میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا گراں نہیں گزرتا ہوگا (میرے اس اصرار و تکرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملت اسلامیہ کو اپنی یہ امید وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم پہ امن و عافیت ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔

اس مکتوبِ گرامی سے جہاں ایک طرف قائدِ اعظم کی عظمتِ کردار، نیرِ درخشاں کی طرح عالمتاب ہو جاتی ہے دوسری طرف وہ 'حکیم الامت' کی دیدہ درسی کی بھی بین شہادت بن جاتا ہے کہ انہوں نے کن حالات میں کس شخص کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھا اور آنے والے واقعات نے اسے کس قدر سچ کر دکھایا۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں بزمِ اقبال کے سالانہ اجلاس میں سر عبدالقادر (مرحوم) نے علامہ اقبال کے ایک خط کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے جو انہوں نے ایک دوست کے خط کے جواب میں بسترِ علالت سے ۱۹۳۵ء میں لکھے تھے۔ اس دوست نے علامہ کی صحت کی دعا کی تھی، علامہ نے انہیں لکھا تھا:

میرا وقت پورا ہو چکا ہے اور میرا پیغامِ ملت تک مکمل صورت میں پہنچ چکا ہے۔ میرے لئے صحت کی دعا مانگنے کے بجائے آپ قائدِ اعظم محمد علی جناح اور کمال اتاترک کے لئے درازی عمر کی دعا کیجئے کہ انہیں اپنا مشن پورا کرنا ہے۔

(نوائے وقت ۹ مارچ ۱۹۴۰ء)

اور اب ٹیپ کا بند سنئے، قائدِ اعظم نے ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں یومِ اقبال کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

اگر میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کو قائم ہوتا دیکھنے کے زندہ رہا اور اس وقت مجھ سے کہا گیا کہ ایک طرف اس اسلامی حکومت کے رئیسِ اعلیٰ کا عہدہ ہے اور دوسری طرف اقبال کی تصنیفات میں 'تم دونوں میں سے ایک چیز چن سکتے ہو تو میں اقبال کی تصانیف کو ترجیح دوں گا۔' (ذکرِ اقبال، عبدالمجید سالک ص ۲۲۶)

عام بیٹروں کی سب سے بڑی خواہش سستی شہرت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اس کے لئے وہ کون کون

پا پڑ بیلتے اور کس کس قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں، اس کے لئے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں، یہ ہم سب کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ لیکن قائد اعظمؒ تو کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ انہیں اپنی ذات پر کس قدر اعتماد تھا اور کس قدر شہرت حاصل کرنے سے کس قدر نفرت، اس کے لئے میں صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کافی سمجھتا ہوں۔ جو ہے تو معمولی سا، لیکن اس میں حقیقت بہت بڑی پنہاں ہے۔ مسٹر جناحؒ اسمبلی سیشن کے سلسلہ میں گرمیوں میں اکثر شملہ تشریف لایا کرتے تھے۔ لیکن جب وہ قائد اعظمؒ کی حیثیت سے پہلی بار شملہ آئے تو مسلمانان شملہ نے ان کے لئے تاریخی جلوس نکالنے کا فیصلہ اور اہتمام کیا۔ ریلوے اسٹیشن سے وہ ایک کھلے رکشا میں سوار ہوئے کہ وہاں اسی سواری کی اجازت تھی اور مال روڈ سے آگے بڑھے۔ مال روڈ پر تو سرکاری دفاتر تھے۔ لیکن آگے جا کر ایک راستہ لوٹر بازار کی طرف اترتا تھا جہاں عام کی آبادی تھی اور وہ ان کے انتظار میں چشم براہ تھے۔ قائد اعظمؒ انگریزی لباس میں ملبوس تھے جو ان کا اس زمانے کا معمول تھا۔ اور ان کا سفید رنگ کا بڑا سا "ٹوپ" ان کے زانوؤں پر دھرا تھا۔ اس زمانے میں انگریز دشمنی کی بنا پر انگریزی ٹوپی کو بڑی نفرت سے دیکھا جاتا تھا۔ اس مقام پر بعض دوستوں کے دل میں یہ خیال ابھر کہ لوٹر بازار کے مسلمان اپنے تلی راہ نما کو پہلی بار دیکھیں گے۔ وہ متوقع ہوں گے کہ یہ راہ نما "اسلامی لباس" میں ملبوس ہوگا۔ اسلامی لباس سے اس زمانے میں مراد شیروانی، شلوار یا پاجاما اور ترکی ٹوپی تھی۔ وہ جب انہیں اس لباس میں دیکھیں گے تو ان پر کچھ اچھا اثر نہیں ہوگا۔ لیکن اس وقت اس سلسلہ میں ہو کیا سکتا تھا۔ بعض احباب نے کہا اور کچھ نہیں تو جناح صاحب سے کہا جائے کہ وہ کم از کم اپنے "ٹوپ" کو نیچے رکھ لیں تاکہ وہ نمایاں طور پر دکھائی نہ دے۔ اس جرأت مندانہ اقدام کے لئے قرعہ فال مجھ دیوانے پر پڑا کیونکہ احباب جانتے تھے کہ مجھے قائد اعظمؒ سے شرفِ نیاز حاصل تھا۔ وقت کی کمی اور جذبات کی شدت کی وجہ سے میں نے بھی اس اقدام کی نزاکت پر غور نہ کیا اور آگے بڑھ کر قائد اعظمؒ کے کان میں یہ بات کہی انہوں نے اسے سنا اور اگرچہ میں نے محسوس کیا کہ انہیں یہ مشورہ خوش نہیں۔ انہوں نے اپنے مخصوص مشفقانہ انداز سے میرے کان میں جو کچھ کہا اس کا ملخص یہ تھا کہ "کیا تم لوگ مجھے ہباتا گاندھی بنا دینا چاہتے ہو۔ جناح ان سطحی حربوں سے پاولر نہیں بننا چاہتا۔ اگر اس میں خلوص اور خدمت کی جاذبیت ہوگی تو یہ خود بخود مقبول نام ہو جائے گا۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو اس طرح حاصل کی ہوئی ہر دلعزیزی بڑی ناپائیدار ہوگی۔ ویسے ممکن تھا کہ میں اس ٹوپی کو نیچے رکھ دیتا۔"

لیکن اب ایسا کرنا منافقت ہوگا جس کی کم از کم مجھ سے توقع نہ رکھو" یہ کہا اور اس ٹوپ کو زانوؤں سے اٹھا کر زیب سر کر لیا اور اسی ہیئت سے جلوس کے راستوں سے گزرے۔

اب ہاتما "کی زندگی کی بھی ایک جھلک دیکھتے جاتے جس کی طرف قائد اعظم نے اشارہ کیا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا وہ ایک دھوٹی پہنے، تھوڑا کلاس میں سفر کرتے اور وہلی میں بھنگی کا لونی میں قیام پذیر ہوتے تھے تاکہ وہ عوام کے لیڈر بن سکیں۔ دسمبر ۱۹۷۵ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ایک انٹرویو اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں اس نے تقسیم ہند کے سلسلے میں اپنے بعض مشاہدات اور واقعات کا ذکر کیا تھا۔ اس ضمن میں اس نے کہا تھا کہ اس نے ایک دن مسز سر و جینی نیڈو سے کہا کہ

میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ لوگ ہاتما گاندھی کو تھوڑا کلاس میں سفر کرنے اور بھنگیوں کی بستی میں اچھوتوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے کر اپنی اس قدر قیمتی متاع کے لئے ایسا خطرہ کس طرح مول لیتے ہیں؟

اس کے جواب میں مسز نیڈو نے کہا کہ

ہم ان کے لئے ریل کے ڈبے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسے اچھی طرح صاف کراتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں جنہیں ان کے ساتھ سفر کرنا ہوتا ہے اور انہیں اچھوتوں کے سے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ وہلی میں ہم بھنگیوں کی بستی کی صفائی کا خاص طور پر اہتمام کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو ان کے ساتھ رکھنا مقصود ہوتا ہے انہیں بھی بھنگیوں جیسے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ اس "بوڑھے" کو اس طرح مفلسی اور اور غریبی کی حالت میں دکھانے کے لئے کانگریس کو جو کھیل کھیلنا پڑتا ہے وہ بہت ہنگام پڑتا ہے۔

بہر حال یہ تھا قائد اعظم کا حسن کردار جس سے متاثر ہو کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن جیسے کینہ پرور دشمن کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ

جناح کی شخصیت بھی بڑی نمایاں اور ممتاز تھی۔ چٹان کی طرح اپنے مقام پر محکم اور سخت۔ اور اس کے ساتھ انتہائی درجہ کا ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تم اس کے سینے کی گہرائیوں میں اتر سکو۔ نہایت ذہین و فطین۔

وہ میرے دلائل کو نہایت آسانی سے سمجھ جاتا لیکن اس کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے اپنے اور میرے درمیان کوئی پردہ لٹکا دیا ہو۔ وہ تمام دلائل کو ایک طرف رکھ دیتا اور میں ان کے جواب کے لئے اس کے دماغ میں ذرا سا تحریک پیدا کرنے میں بھی ناکام رہتا۔ میں اسے اس کے مقام سے ذرا سا بھی سرکا نہ سکتا۔

اس نے (بی بی سی) کے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ مسٹر جناح پاکستان کو ایک مسلم سٹیٹ کی شکل میں متشکل کرنے کے لئے دیوانہ تھا۔  
(پاکستان ٹائمز ۱۲ نومبر ۱۹۸۰ء)

## انگریز کے خلاف

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے جن لوگوں کے دل میں تحریک پاکستان کے خلاف جست باطن اور قائد اعظم کے خلاف آتش انتقام شعلہ زن ہے وہ ان کی ذات پر منجملہ دیگر خرافات، یہ الزام بھی لگایا کرتے ہیں کہ تحریک تقسیم ہند انگریزوں کی اسکیم تھی اور قائد اعظم ان کا آلہ کار تھا۔ میں اس سلسلہ میں دو ایک ایسی شہادت پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے واضح ہوگا کہ تحریک پاکستان کے دوران قائد اعظم نے ہندوؤں کے ساتھ انگریزوں کو بھی کس طرح تناڑ اور کس طرح ہر موقع پر ان کے خلاف ٹٹ کر کھڑے ہو گئے جب انہوں نے ۱۹۴۲ء میں دیکھا کہ انگریز ہندوؤں کی "ہندوستان چھوڑو" کی جارحانہ کارروائیوں سے مرعوب ہو کر ان کی طرف جھکتا جا رہا ہے تو انہوں نے اپنی ایک تقریر میں برہم کہا کہ اگر ہندو اور انگریز نے کوئی ایسا سمجھوتہ کر لیا تو غیر ملکی سنگینوں کی پروا نہ کرتے ہوئے جن کے سائے میں کانگریسی راج رچایا جا رہا ہوگا ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دیں گے اور اسے مفلوج اور معطل بنا کر رکھ دیں گے۔ اسے تسلیم کرنا ہمارے لئے انتہائی اندوہناک اور سنگین نتائج کا موجب ہوگا۔ اس ظالمانہ اقدام سے برصغیر کے مسلمانوں کا مستقبل تیرہ وتار ہو جائے گا اور ان کی آزادی پر خط تہ تیغ کھینچ جائے گا۔

اس سے پہلے ایک مرتبہ جب مسٹر گاندھی نے بھی قائد اعظم کے خلاف یہ الزام عائد کیا تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جناح صاحب کی امیدیں دولت برطانیہ سے

وابستہ ہیں۔ کوئی چیز جو کانگریس کرے اور دے، انہیں مطمئن نہیں کر سکتی۔

تو انہوں نے کھٹ سے جواب دیا تھا کہ

یہ قطعی افترا اور مسلمانان ہند کی توہین ہے جس کا مسٹر گاندھی جیسے مرتبہ کی شخصیت کو مرتکب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں مسٹر گاندھی کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مسلمانان ہند اپنی اور صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لئے کانگریس اور برطانیہ دونوں کے خلاف آخری خندق تک لڑنے کا عزم کر رکھا ہے اور کسی دوسرے پر تکیہ نہیں کرنا چاہتے۔

قائد اعظم تو یہ کہہ رہے تھے اور مسٹر گاندھی جو قائد اعظم کے خلاف اس قسم کے الزامات تراش رہے تھے، ان کی اپنی حالت یہ تھی کہ انہوں نے ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے جریدہ اسٹیشنر میں 'برطانوی سامراج کے علیٰ حالہ قائم رکھے جانے کی تائید میں لکھا تھا کہ

تھوڑی دیر کے لئے غور کیجئے کہ اگر انگریز اچانک ملک کو خالی کر دیں تو کیا ظہور پذیر ہوگا؟ اگر ملک میں حکومت کرنے کے لئے کوئی بیرونی طاقت موجود نہ ہو تو اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ پنجابی، خواہ وہ مسلمان ہوں یا سکھ، ہندوستان کو اپنی جولانگاہ بنالیں گے..... ہم نے ملک میں جمہوریت کا جو ڈھونگ رچا رکھا ہے وہ تو صرف انگریز کی سنگینوں کی امداد پر منحصر ہے۔ پس اگر کسی کو یہ ضرورت ہے کہ کسی طاقتور عنصر کی دست برد سے ملک کو بچانے کے لئے انگریز یہاں موجود رہیں تو وہ کانگریسی ہندو اور وہ دیگر لوگ ہیں جن کی نمائندگی کا کانگریس کو دعویٰ ہے۔

مسٹر گاندھی کو انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کا غم یوں ستا رہا تھا۔ اس کے برعکس 'قائد اعظم' لندن ٹائمز کے ایک مقالہ کا جواب دیتے ہوئے حکومت برطانیہ پر واضح کر رہے تھے کہ میں بلا خوف و تردید یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسلم لیگ، ملت اسلامیہ کی نمائندگی اس سے زیادہ صحیح معنوں میں اور موثر طریق پر کر رہی ہے جس طرح کہ ملک معظم کی موجودہ حکومت برطانوی قوم کی کر رہی ہے۔ اگر اخبار "ٹائمز" کا یہ خیال ہے کہ حکومت



برطانیہ کے سائے میں مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر کوئی فیصلہ ان کے سرمنڈھا جا سکتا ہے تو وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مسلمان قطعاً اس کے لئے تیار نہیں کہ اپنی تقدیر اور مستقبل کو کسی دوسرے کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ یہ آخری فیصلہ خود مسلمان ہی کر سکتے ہیں کہ کیا کچھ ان کے لئے بہتر ہے۔ بنا بریں وہ تمام عتاصر جو ہندوستان کے مستقبل کی تشکیل میں حصہ دار ہیں ان سب پر لازم ہے کہ مسلمانوں کو ایک معزز اور ذمہ دار قوم متصور کریں۔

۱۹۴۰ء کے شروع میں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہندو اور انگریز ہندوستان کے مستقبل کے متعلق مسلمانوں کے علی الرغم کوئی سکیم تیار کر رہے ہیں اس پر قائد اعظم نے راجکوٹ سے بیان شائع کیا جس میں انتہائی پرجلال انداز میں کہا کہ

ہیں انتباہ کئے دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وائسرائے اور حکومت برطانیہ پورے طور پر اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ ماضی کی صورت حال کا اعادہ کیا گیا یا ان ضمانتوں کو پورا نہ کیا گیا جو دی جا چکی ہیں یا ان کا احترام ملحوظ نہ رکھا گیا تو ہندوستان میں نہایت ہی خطرناک صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ مسلم ہندوستان ان تمام ذرائع سے جو اس کے اختیار میں ہیں، ایسی صورت کا مقابلہ کرے گا اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔

اسی طرح انہوں نے انگلستان کے اخبار "ڈیلی میل" کے نمائندہ کو ایک بیان دیا جس میں واشگاف الفاظ میں کہا کہ

مجھے بتا دینا چاہیے کہ اب ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ اسلامی ہندوستان اپنے مستقبل یا اس ملک کے دستور کی تشکیل میں اپنے حقوق کو مسٹر گاندھی کے مفروضہ ٹریبونل یا کسی اور طرز کے ادارے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے گا، نہ اسلامیان ہند اس پر تیار ہیں کہ حکومت برطانیہ کے آخری فیصلہ کو قبول کر لیں، ہمارے لئے کیا کچھ بہتر ثابت ہو سکے گا اس کا قطعی اور آخری فیصلہ خود اسلامیان ہند کی منشا پر موقوف ہے اور وہی اس کے آخری جج ہوں گے۔

## ماؤنٹ بیٹن کا اعتراف

اس موضوع پر میں بکثرت دیگر شہادات بھی پیش کر سکتا تھا۔ لیکن قلتِ گنجائش اس کی مانع ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے 'خبرتِ باطن' کی طرف سے عائد کردہ اس اتہام کی تردید ہو گئی ہوگی کہ تقسیم ہند کی سکیم برطانیہ کی تخلیق تھی اور قائدِ اعظم اس کے آلہ کار بن کر کھٹ پتلی کارول ادا کر رہے تھے۔ لیکن ان شہادات میں اگر کسی اضافہ کی ضرورت ہے تو میں اسے بھی پیش کئے دیتا ہوں۔ تقسیم ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی۔ ۱۹۴۵ء کے اواخر میں بی۔ بی۔ سی لندن سے اس کا ایک انٹرویو براڈ کاسٹ ہوا تھا۔ اس میں اس سے سوال کیا گیا کہ

کیا اُس وقت ہندوستان کو متحد رکھنے کا کوئی امکان تھا؟

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا۔

میں ہندوستان گیا ہی اس مقصد کے لئے تھا کہ اسے کسی طرح متحد رکھ سکوں۔

ہم صدیوں کے بعد اس ملک کو چھوڑ رہے تھے تو چاہتے تھے کہ اسے ایک متحد ملک

کی شکل میں چھوڑ کر جائیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ اس کا ٹکڑے

ٹکڑے ہو جانا ایک الم انگیز حادثہ تھا۔ جس سے ہندوستان کی قوت پارہ پارہ ہو جاتی۔

لہذا میں نے اس مقصد کے لئے انتہائی کوشش کی۔ لیکن اس کی راہ میں ایک ایسا

شخص حائل تھا جو پہاڑ کی طرح رکاوٹ بنے کھڑا تھا اور وہ تھا مسٹر جناح، صدر

مسلم لیگ، جو شروع ہی سے "نہ" کہتا چلا گیا اور اس کے اس ارادہ کو بدلنے کے

لئے میری ہر کوشش ناکام رہ گئی۔ مجھے بالآخر اس کے سامنے جھکنا پڑا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں اس سے زیادہ کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔

قائدِ اعظم کی سیاست کا یہ انتہائی باکمال کارنامہ ہے کہ انہوں نے یہ چومکھی لڑائی اس انداز سے

لڑی کہ نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کیا، نہ جلاؤ لگھیراؤ کے فسادات برپا کئے نہ شورشیں اٹھائیں نہ اینٹ پتھر برسائے۔

صرف اپنے تدبیر فرارست اور عظمتِ کردار سے یہ مہیب جنگ اس طرح جیت لی کہ تاریخ اس پر آج تک

انگشت بنداں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معرکہ آرائی میں ان کے سامنے کوئی خطرات نہیں تھے۔ تحریک کے دوران تو انہوں نے ان خطرات کا ذکر نامناسب نہ سمجھا، البتہ تشکیل پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں کراچی کلب میں انہوں نے اپنی محترمہ بہن 'مس فاطمہ جناح' (مرحومہ) کی جانفشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ

جن دنوں مجھے برطانوی حکومت کے ہاتھوں کسی وقت بھی گرفتاری کی توقع تھی تو ان دنوں میری بہن فاطمہ ہی تھی جو میری بہت بندھاتی تھی۔ جب حالات کے طوفان مجھے گھیر لیتے، تو میری بہن ہی تھی جو میری حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ تفکرات پریشانیوں اور سخت محنت کے زمانے میں، جب میں گھرا تا تھا تو میری بہن روشنی اور امید کی تیز شعاع کی صورت میں میرا خیر مقدم کرتی تھی۔ اگر میری بہن نہ ہوتی تو میرے تفکرات کہیں زیادہ ہوتے۔ میری صحت کہیں زیادہ خراب ہوتی۔ اس نے لاپرواہی سے کام نہیں لیا۔ کبھی شکایت نہیں کی۔ میں آج ایسے واقعات کا انکشاف کرتا ہوں جو غالباً آپ نہیں جانتے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ ہمیں ایک عظیم انقلاب کا سامنا تھا۔ ہم گولیوں کی بوچھاڑ میں حشی کہ موت تک کے مقابلے کے لئے آمادہ اور تیار تھے۔ میری بہن نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ میرے شانہ بشانہ رہی۔ میری انتہائی معتمد رہی اور مجھے سنبھالے رکھا۔

(فاطمہ جناح: "میرا بھائی" بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر، اگست ۱۹۷۶ء، ص ۱۳)

جب ۱۹۴۶ء میں قائد اعظم نے راست اقدام کا فیصلہ کیا تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بمبئی کے مشہور کانگریسی ہفتہ وار اخبار بلٹرن نے لکھا تھا کہ

مسلم لیگ کے بدترین دشمن بھی مسٹر جناح کی لیڈرشپ (قیادت) کو رشک کی نگاہوں سے دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔ لیگ نے پچھلے ہفتہ جو عظیم انقلابی فیصلہ کیا ہے اس سے ہمارے دلوں میں بے ساختہ یہ آواز اُبھرتی ہے کہ کاش انڈین نیشنل کانگریس میں 'جناح' جیسے مسلم الثبوت تدبیر کا ماہر کوئی ایک لیڈر ہوتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسٹر جناح کے اس فیصلے نے انگریز اور کانگریس دونوں کو بوکھلا

کر رکھ دیا ہے اور اس عامیانہ الزام کی دھجیاں بکھیر دی ہیں کہ مسلم لیگ، برطانوی  
استعمار کی پروردہ جماعت ہے۔ (اصفہانی ص ۱۸۸)

قائد اعظم نے ۱۹۴۸ء میں اس راز کو منکشف کیا تھا کہ تحریک پاکستان کے دوران ایسے وقت بھی آئے  
تھے جب ہر آن ان کی گرفتاری کا امکان تھا۔ اس راز کو انہوں نے اپنی بہن محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ)  
کی جاں نثارانہ خدمات کا ذکر کرتے ہوئے افشا کیا۔ لیکن اس قدر جاں نثار اور رفاقت شعار بہن کو بھی  
انہوں نے کوئی عہدہ دینا تو ایک طرف، مسلم لیگ میں بھی کوئی منصب تفویض کرنا پسند نہ کیا کہ اس  
میں اقربانوازی کا شائبہ ہوتا جس نے ہماری حیاتِ ملی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اقربانوازی کا ایک موقع ان  
کے سامنے آیا جسے ان کی دوسری ہمیشہ شیریں بانی (مرحومہ) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

جب مرحوم چندر پور نے قائد اعظم کے لائق بھائی، اکبر پیر بھائی کو مقامی مسلم لیگ  
کی کسی ذیلی کمیٹی کا چیئرمین بنانے کی تجویز قائد اعظم کو پیش کی تو انہوں نے اسے یہ  
کہہ کر مسترد کر دیا کہ اکبر کی سب سے بڑی "نااہلیت" یہ ہے کہ وہ میرا رشتہ دار ہے۔

(جنگ کراچی، ۹ جولائی ۱۹۷۲ء بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر، اگست ۱۹۷۶ء)

اس سے آپ قائد اعظم کے حسن کردار ہی کا نہیں، دورنگی اور مال اندیشی کا بھی اندازہ لگایجئے۔ اس کے  
ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ اس مردِ جلیل نے یہ ساری لڑائی کس ساز و سامان کے ساتھ لڑی تھی۔ انہوں نے  
اپنی ایک تقریر میں پہلے ان مشکلات کا ذکر کیا جو حصولِ پاکستان کی راہ میں درپیش تھیں اور کہا کہ  
"اگرچہ میں نے یہ بات صاف اور واضح الفاظ میں بیان کر دی ہے، لیکن میں شکست تسلیم کرنے کا  
بھی قائل نہیں۔ مجھے اپنی قوم پر بھروسہ ہے۔" اس کے بعد انہوں نے کہا:-

اورنگ زیب روڈ (نئی دہلی) پر میری نجی قیام گاہ کو شاید رشک کی نگاہوں سے دیکھا  
جائے مگر یہ تو دیکھئے کہ ہمارا سیکرٹریٹ کہاں ہے اور فوج کہاں! امیر اسلم خانہ اس  
قدر ہے۔ ایک اٹاچی کیس (جسے انہوں نے جلسہ میں نمایاں کر کے دکھایا تھا)  
ایک ٹائپ رائٹر اور ایک پرسنل اسٹنٹ (بس یہ ہے ہمارا ساز و دیراق اور اسلحہ  
اور فوج)۔

۱ عربک کالج، دہلی، ۱۹۴۲ء بحوالہ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۴۸ء

سچ کہا تھا اقبالؒ نے ے

ننگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پڑ سوز یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے  
اس ساز و سامان کے ساتھ لڑنے والا قائدؒ کبھی لڑائی نہیں ہارتا۔ قائدِ اعظمؒ کے اپنے الفاظ میں:-  
اخلاقی قوت، جرات، محنت اور استقلال وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی پوری  
عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے۔ میں کبھی ناکامی کے لفظ سے آشنا نہیں ہوا۔  
لیکن ان چار میں ایک اور جز کو بھی شامل کرنا چاہیے اور وہ ہے خونِ جگر جس کے بغیر اقبالؒ کے الفاظ میں ہر  
نقش نامتو رہ جاتا ہے۔ شعرِ اقبالؒ میں تو خونِ جگر \_\_\_\_\_ کے الفاظ استعارہ کے طور پر استعمال  
ہوتے ہیں، لیکن قائدِ اعظمؒ نے سچ مچ اپنے خونِ جگر سے اس نقش کی تکمیل کی تھی۔

## قائدِ اعظمؒ کی صحت

یہ داستان عبرت آموز بھی ہے اور دل سوز بھی جسے میں باچشمِ نم بیان کر سکوں گا۔ آپ بھی دل  
تھام کر سنئے۔ قائدِ اعظمؒ کی صحت ایک عرصہ سے خراب چلی آرہی تھی۔ محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کا  
بیان ہے کہ

ہم ۱۹۴۲ء میں بمبئی سے دہلی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔  
کچھ دنوں سے قائدِ اعظمؒ کو بخار کی شکایت تھی۔ قائدِ اعظمؒ نے کھانا کھایا اور بستر پر  
لیٹ گئے۔ اپنا ناک انہوں نے اونچی اونچی آہیں بھرنے شروع کر دیں۔ جیسا کہ کسی  
آدمی کو گرم لوبہ کی سلاخ سے چھوا جاتے ہیں اسی لمحے ان کے پاس نہی اور تکلیف  
کی وجہ دریافت کی اور قائدِ اعظمؒ نے ہاتھ کے اشارے سے درد زدہ جگہ کی نشان دہی  
کی۔ درد کی شدت سے ان کی قوتِ ناطقہ جواب دے چکی تھی۔ میں نے درد زدہ جگہ کو  
ہاتھ لگایا تو ناامید ہو کر اگلے سیشن کے آنے کا انتظار کرنے لگی تاکہ گرمائش دینے  
کے لئے گرم پانی کی بوتل کا انتظام کر دیا جائے۔ اگلے چند لمحوں میں گاڑی رکھنے کی آواز  
آئی تو میں نے گاڑی کو بلوایا اور گرم پانی کی بوتل لانے کو کہا۔ نپکن میں پیٹ کر بوتل کو  
اؤف جگہ پر رکھا جس سے درد میں کمی محسوس ہوئی۔ (میراجھانی صفحہ)

اسی طرح مرحومہ نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

۱۹۴۱ء میں ہم بمبئی سے مدراس روانہ ہوئے جہاں قائد اعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرنی تھی۔ جب ہماری گاڑی مدراس سے کچھ دور تھی تو قائد اعظم اپنی نشست سے اُٹھے۔ میں یہ دیکھ کر پریشان ہوئی کہ وہ چند قدم چل کر ریل کے لکڑی سے بنے ہوئے فرش پر گر پڑے۔ میں فوراً ان کے پاس پہنچی اور تکلیف کی وجہ معلوم کی۔ قائد اعظم ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے کہ میں تکان اور کمزوری محسوس کرتا ہوں۔ اور پھر قائد میرے کندھوں کا ہمارا لے کر اپنے برتھ کی طرف بڑھے خوش قسمتی سے گاڑی سٹیشن پہنچی جہاں ہزاروں مسلم لیگی قائد کا استقبال کرنے کھڑے قائد اعظم زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا، زور سے چلا کر کہا کہ زیادہ شور نہ کریں کیونکہ قائد اعظم تکان اور بخار کی وجہ سے بستر پر ہیں دوڑ کر ڈاکٹر لے آئیں۔ چند لمحوں میں ڈاکٹر آیا۔ اس نے معائنے کے بعد کہا کہ فکر مند ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ذرا نبض گر گئی تھی۔ (میرا بھائی ص ۱۷)

صحت کی اس قدر کمزوری کا تقاضا تھا کہ قائد اعظم آرام کرتے۔ مرحومہ کا بیان کا ہے کہ وہ جب بھی انہیں آرام کرنے کے لئے کہتیں تو وہ جواب میں کہتے کہ

فاطمہ! کیا تم نے کبھی یہ بھی سنا ہے کہ ایک جرنیل چھٹی پر چلا جائے جبکہ اس کی فوج

اپنی بقا اور سلامتی کی جنگ میں مصروف ہو! (میرا بھائی ص ۱۷)

اس جرنیل نے چھٹی نہ لی اور محض اپنی قوتِ ارادی اور مقصد پیشِ نظر سے عشق کے بل بوتے پر مسلسل اور پیہم مصروفِ جنگ رہا۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ شدت اور تن و ہوس کے ساتھ۔

لیکن یہ قوتِ ارادی فطرت کے اٹل قانون کا کب تک اور کہاں تک مقابلہ کرتی۔ آخر کار ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا جسے اس فدائے ملت نے خاص اہتمام سے راز میں رکھا۔ حتیٰ کہ اس میں اپنی زندگی کی سب سے زیادہ معتد علیہ رازواں بہن کو کبھی شریک نہ کیا۔ یہ راز راز ہی رہتا اگر اسے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ذاتی ڈائری کے اوراق افشا نہ کرتے۔ یہ ڈائری ۱۹۷۵ء میں (فریڈم ایٹ بڈناٹ) نامی کتاب میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تیزی سے گرتی جانے والی صحت کے متعلق قائد اعظم

نے اپنے ذاتی ڈاکٹر (جو پارسی تھا) سے مشورہ کیا۔ اس نے "ایکس رے" لے کر کہا کہ آپ کے دونوں پھیپھڑے بڑی طرح دق آلود ہو چکے ہیں۔ اگر آپ نے کامل آرام اور سکون اختیار نہ کیا تو آپ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکیں گے۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس پر قائد اعظم نے کیا کہا؟ انہوں نے ڈاکٹر سے کہا کہ نہ اس ایکس رے کو کسی کے سامنے آنا چاہیے اور نہ ہی اس بات کا تذکرہ تمہاری زبان پر۔ چنانچہ ایکس رے کی وہ فلم بھی سر بہر ہو گئی اور ڈاکٹر اور مریض کے لب بھی بدل گئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس راز کو سر بہر رکھنے سے مقصد کیا تھا؟ اسے اسی کتاب کے مصنفین کی زبان سے سنتے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

اگر ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال نہرو یا مہاتما گاندھی اپریل ۱۹۴۷ء میں اس سر بہر راز سے واقف ہو جاتے تو تقسیم ہند کا حادثہ کبھی رونما نہ ہوتا۔

## نا تابل خرید

اس مردِ مجاہد نے اس "حادثہ" کو سر بہر رکھنے کے لئے اپنے خونِ جگر کا آخری قطرہ تک سچوڑ کر رکھ دیا۔ اس کا یہ خونِ جگر رنگ لایا۔ اس نے جان دے کر اس عظیم مملکت کو حاصل کر لیا اور بلا مزد و معاوضہ ہم نابلوں کو اس کا وارث بنا کر خاموشی سے دنیا سے چلا گیا۔ ان کی وفات پر دنیا بھر کے عظیم مشاہیر جن میں دوست اور دشمن سب شامل تھے، انتہائی احترام و تکریم کے ساتھ ان کی بارگاہ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اگرچہ ان گل ہائے عقیدت کی ایک ایک پتی اپنی جگہ منفرد و اہمیت کی حامل ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسز سرور جٹی نیڈو نے (قائد اعظم کی زندگی میں) ان کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ ان کی عظمتِ کردار کی سب سے زیادہ درخشندہ دلیل ہے۔ اس نے کہا تھا کہ

میں بڑی مدت سے مسٹر جناح کو جانتی ہوں۔ ان کے بارے میں خواہ کوئی رائے بھی

قائم کی جائے، لیکن میں یہ پورے دثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ انہیں کسی قیمت

پر بھی خرید نہیں جاسکتا۔

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ہندوستان کو فیڈریشن بنانے کی سکیم پیش کی گئی تو

قائد اعظم نے اس کی سختی سے مخالفت کی۔ انگریز کی انتہائی خواہش تھی کہ وہ سکیم پروان چڑھ جائے۔ قائد اعظم کو ہمنوا بنانے (بلکہ یوں کہیے کہ خریدنے کے لئے) برطانیہ کے وزیر اعظم لارڈ رمزے میکڈانلڈ نے انہیں ذاتی ملاقات میں کہا کہ

اگر سنہا ایک صوبے کا گورنر بن سکتا ہے تو کوئی اور بھی بن سکتا ہے۔ اگر سنہا لارڈ کا خطاب حاصل کر سکتا ہے تو کوئی اور بھی حاصل کر سکتا ہے۔

اس نے سمجھا کہ صوبے کی گورنری یا لارڈ کا خطاب اتنی بیش بہا قیمت ہے جس کے عوض کسی ہندوستانی کو بھی آسانی سے خریدا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کے جواب میں قائد اعظم نے کیا کہا۔ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموشی سے وزیر اعظم کے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ اس پر رمزے میکڈانلڈ بیحد متعجب ہو اور قائد اعظم سے الوداعی الفاظ کہنے کے ساتھ یہ پوچھ ہی لیا کہ آپ کا ایسا رد عمل کیوں ہے؟ قائد اعظم نے اس کے جواب میں انتہائی متانت سے کہا کہ

اب میں آپ سے آئندہ کبھی نہیں ملوں گا کیونکہ آپ مجھے بکاؤ مال سمجھتے ہیں۔

(بحوالہ چٹان، ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء)

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہی

یہ تو ایک صوبے کی گورنری کی پیش کش تھی۔ اس کے بعد ایک ایسا وقت آیا جب انہیں پورے ہندوستان کی حکومت کی پیش کش کی گئی۔ ۱۹۴۷ء کی قرارداد پاکستان کے بعد تقسیم ہند کی سکیم کی مخالفت کرتے ہوئے کانگریس کے بزرگ ترین لیڈر مسٹر راج گوپال اچاریہ نے کہا کہ

اگر ملک معظّم کی حکومت ایک نیشنل گورنمنٹ کی تشکیل پر آمادہ ہو تو میں کانگریسی رفقاء کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کروں گا کہ مسلم لیگ اپنا وزیر اعظم نامزد کرے اور اسے قومی حکومت تشکیل کرنے کا موقع دے۔ میں نے شروع ہی میں مسٹر جناح کو یہ پیش کش اس لئے نہیں کی تھی کہ وہ اسے بجا طور پر اپنی ہتک خیال کرتے ہوئے یہ دندان شکن جواب دے سکتے تھے کہ میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوا۔

(طلوع اسلام جون ۱۹۴۶ء)

قائد اعظم نے اسمبلی کی تقریر میں اس کا جواب یوں دیا۔



اگر سٹریمرے (یعنی نمائندہ حکومت برطانیہ) اس تجویز کو منظور کر لیتے اور اس کے بعد مجھے یہ پیشکش کی ہوتی تو کیا اس وقت بھی میری طرف سے اس کا وہی دنداں شکن جواب نہیں ہو سکتا تھا کہ سٹریمرے اور راج گوپال اچاریہ دونوں میری ہتک کر رہے ہیں۔ میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوا ہوں۔

اور اس تقریر کے آخر میں، یہ غلط انگیز اعلان کیا کہ

ہم نے آخری اور حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ پاکستان ہمارا واحد نصب العین ہے ہم اس کی خاطر مسلسل جدوجہد کریں گے اور اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے کسی کو بھی اس بارے میں غلط فہمی نہیں رہنی چاہیے جمہوری نظام حکومت نکل چکا ہے۔ ہماری تعداد بے شک کم ہے لیکن حکومت کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگر ہم اس کا تہیتہ کر لیں تو قلت تعداد کے باوجود ہم تمہارے لئے اس سے سو گنا مشکلات پیدا کر سکتے ہیں جو کانگریس نے آج تک کی ہیں۔ یہ ایک دھمکی نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اعلان ہے جس سے میں تمہیں متنبہ کر دینا چاہتا ہوں۔

لارڈ رنزے میکڈانلڈ کو جو جواب ملا تھا وہ آپ پہلے سن چکے ہیں۔ اب یہ سنتے کہ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لن لٹھ گو کے ساتھ کیا ہوتی تھی۔ واضح رہے کہ لن لٹھ گو اپنے رعب و داب اور دبدر و وطنظنہ کے لئے مشہور تھا۔ بات یوں ہوتی کہ وائسرائے نے وار کونسل مقرر کی اور اس میں مسلم لیگی وزیر، مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات خاں کو بھی شامل کر لیا۔ قائد اعظم نے وار کونسل کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور ان دونوں حضرات سے کہا کہ وہ کونسل سے مستعفی ہو جائیں۔ جب وائسرائے کو اس کا علم ہوا تو اس نے قائد اعظم کو ملاقات کے لئے بلا بھیجا۔ ملاقات کے لئے گیارہ بجے صبح کا وقت مقرر تھا۔ لیکن قائد اعظم ٹیلی فون پر بار بار یاد دہانی کے باوجود، سو گیارہ بجے سے پہلے وائسریگل لاج نہ پہنچے۔ وہاں جا کر بغیر کسی معذرت کے وائسرائے سے ملاقات کا مقصد پوچھا۔ اس نے کہا کہ آپ کو میرے بیان سے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ قائد اعظم نے اس کے جواب میں کیا کیا؟ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور وائسرائے سے یہ کہتے ہوئے کہ ”مجھے آپ کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں“ کمرے سے باہر نکل گئے۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ممتاز ہندو لیڈر مسٹر کابھی دواریا کا اس نے اپنی کتاب  
 میں لکھا ہے :-

INDIA'S FIGHT FOR FREEDOM

یہ دیکھ کر دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑا گھٹی ہے کہ ہندوستان میں 'مسٹر جناح' کی  
 قامت اور دیانت کا کم از کم ایک لیڈر تو ایسا تھا جس میں اس قدر صداقت اور بیباکی  
 تھی کہ اس نے انگریزوں کے سرانے کے منہ پر کہہ دیا کہ وہ اسے کیا سمجھتا ہے جبکہ باقی  
 ہندوستانی لیڈرز جن میں کانگریس بانی کمان بھی شامل ہے، اس کے سرانے کو بہترین  
 انگلش جنٹلمین اور "بہترین عیسائی جنٹلمین" جیسے خطابات سے نوازا کر اس کی  
 چاپلوسی کر رہے تھے۔ (صفحہ ۳۵۲)

اس سے بہت پہلے مشہور جریدہ اسٹیٹس مین نے اپنی ۱۲ جولائی ۱۹۴۰ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ  
 میں لکھا تھا کہ

یہی ایک لیڈر ہے جس نے ہمیشہ صداقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قائد اعظم ایک ڈکٹیٹر تھے۔ ایسا کچھ وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جنہوں نے نہ  
 قائد اعظم کی سیرت کا بنظر عمیق مطالعہ کیا ہے نہ انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوا ہے جنہیں  
 یہ سعادت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ حقیقت اس کے کس قدر خلاف تھی۔ ایک واقعہ سنئے جسے ان  
 کے پرائیویٹ سیکرٹری (سید مطلوب حسن صاحب) نے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ :-  
 ایک مرتبہ ہندوستانی فوج کے ایک کپتان نے ایک محفل میں قائد اعظم سے پوچھا کہ  
 کیا پاکستان اقتصادی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوگا؟ قائد اعظم نے  
 یہی سوال اس کپتان پر دہرایا۔ اس نے کہا کہ بے شک یہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائیگا  
 اس پر قائد اعظم نے پوچھا کہ تم کس بنا پر ایسا کہتے ہو؟ اس نے کہا کہ اس بنا پر کہ  
 ہمارا قائد ایسا کہتا ہے۔ قائد اعظم نے اس کی طرف غصہ بھری آنکھوں سے دیکھا اور  
 کہا کہ آزاد پاکستان میں تم وہ پہلے افسر ہو گے جسے نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا۔

(نوائے وقت، ۴ جنوری ۱۹۶۷ء)

بات واضح تھی کہ جو شخص اپنی کوئی رائے نہیں رکھتا اور ایک بات کو صرف اس لئے مان لیتا ہے کہ اس کے لیڈر نے ایسا کہہ دیا ہے، قائد اعظم کے نزدیک وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ آزاد پاکستان میں کوئی عظیم ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

## رفقاء کا احترام

یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اپنے تمام رفقاء کے مقابلے میں قائد اعظم کا مقام کس قدر بلند تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے دل میں مخلص کارکنوں کا کس قدر احترام تھا، اس کے متعلق اصفہانی صاحب کی زبان سے سنتے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:-

یہ اس شام کا واقعہ ہے جب ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہونے والا تھا۔ میں نے اور راجہ صاحب محمود آباد نے مسٹر جناح اور مس فاطمہ جناح کے ساتھ کھانا کھایا۔ ہم نے قائد اعظم سے اجازت چاہی تاکہ ہم ان کے سیشن میں پہنچنے سے پہلے مجلس عاملہ کے ارکان کی حیثیت سے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ہمیں خدا حافظ کہتے، انہوں نے کہا کہ ذرا ٹھہر جاؤ، ہم اکیٹھے سیشن جائیں گے۔ ہمارے لئے یہ فرمان بڑا تعجب انگیز تھا۔ لیکن ہمیں تسلیم ختم کرنا پڑا۔ ہم چاروں ایک ہی گاڑی میں پنڈال پہنچے اور میں اور راجہ صاحب دروازے پر ٹھہر گئے تاکہ قائد اعظم اور ان کی ہمیشہ آگے تشریف لے جائیں اور ہم پنڈال میں ان کے بعد پہنچیں۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب قائد اعظم آگے نہ بڑھے اور ہم سے کہا کہ ہم چاروں ہمدوش ایک ہی لائن میں پنڈال میں داخل ہوں گے۔ ہم لاکھوں کے مجمع میں اس طرح چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ انہوں نے انتہائی مسرت کے لہجے میں کہا: "میرے عزیزو! کیا تم اس منظر کو دیکھ کر فرط مسرت سے جھوم نہیں اٹھتے؟ اس لاکھوں کے مجمع کو دیکھو اور پھر سوچو کہ ہم نے تھوڑے سے وقت میں اتنی لمبی مسافت طے کر لی ہے۔ میں آج آپ کو ساتھ لے کر اس لئے پنڈال میں داخل ہوا ہوں کہ میں اس احترام کا اظہار کر سکوں جو آپ کا میرے دل میں ہے اور ان لاکھوں ناظرین

کو دکھا سکوں کہ میں پُرِ خلوص خدمات کی اتنی قدر کرتا ہوں۔

(صفحات ۱۰۸، ۱۰۷)

سوچئے کہ کیا ڈکٹیٹروں کی یہی ذہنیت ہوتی ہے؟

## امیر المؤمنین!

سٹر اصفہانی نے دوسری جگہ لکھا ہے کہ

ایک دفعہ ان کے بعض مداحوں نے جوشِ عقیدت میں انہیں امیر المؤمنین کہہ کر

پکارا۔ انہوں نے فوراً روک دیا اور کہا کہ میں امیر المؤمنین نہیں ہوں۔ میری تعریف

میں حد سے مت بڑھو۔ (ص ۱۱)

علی گڑھ یونیورسٹی کے ساتھ قائد اعظمؒ کو جس قدر گہرا تعلق تھا اور وہاں کے طلباء کے دل میں ان کا احترام

جس قدر تھا، اس کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ ان کے اسی احترام اور

عظمت کے پیش نظر اس یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لار کی ڈگری کی پیشکش کی لیکن قائد اعظمؒ نے اسے یہ

کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ

میں سٹر جناح ہی اچھا ہوں، آپ کا شکریہ!

(قائد اعظمؒ کی خط و کتابت، مرتبہ سید شریف الدین پیرزادہ، ص ۹۷)

عام تاثر یہ ہے کہ قائد اعظمؒ حارویا بس قسم کے قانون داں اور ان منطقی مزاج انسانوں میں سے

تھے جن میں حسِ لطیف کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ صحیح نہیں۔ ان کی شخصیت علامہ اقبالؒ کے اس مثالی

کردار کی زندہ پیکر تھی جس کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ

تنے پیدا کن از مشیتِ غبارے      تنے محکم تراز سنگینِ حصارے

درونِ اودلِ درو آشنائے      چو جوئے در کنارِ کوہسارے

## حسِ لطیف

ان کے آہنی پیکر میں قلبِ سلیم بریشم کی طرح نرم اور بھول کی طرح شگفتہ تھا۔ حقیقت یہ ہے

کہ جو انسان جذباتِ لطیف سے عاری ہو وہ انسان نہیں، حیوانی سطح پر ہوتا ہے جس مزاج اسی ذوقِ لطیف کی مظہر ہوتی ہے اور قائدِ اعظمؒ کو اس کا بہرہ وافر عطا ہوا تھا اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہ مزاج اور استہزاء میں فرق کرنا جانتے تھے۔ اُن کا نشتر ٹھیک ٹھکانے پر لگتا جس سے ان کے ہدف کی کیفیت یہ ہو جاتی کہ \_\_\_\_\_ جگر میں ٹیس لب ہنسنے پر مجبور \_\_\_\_\_ اور جب ان کا ہدف گاندھی جیسا سنگا حریف ہوتا تو اس طنز کی شوخی رنگین تر ہو جاتی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہندوستان کے تمام نیشنل اخبارات نے ایک واقعہ کو شہ سرخیوں کے ساتھ اچھالا۔ کہا یہ گیا کہ کل شام بہاتا گاندھی شیوگاؤں میں اپنی کٹی میں تنہا پرارتھنا میں محو تھے کہ باہر سے ایک بڑا سانپ اندر گھس آیا۔ بہاتا جی کو اس پر ذرا سا بھی تردد نہ ہوا۔ وہ بدستور پرارتھنا میں محو رہے۔ سانپ نے بہاتا جی کے گرد چکر لگایا اور جس طرح خاموشی سے آیا تھا اسی طرح خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اخبارات نے اسے بہاتا جی کی بہت بڑی کرامت قرار دیا اور ملک بھر میں اس واقعہ کی دھوم مچ گئی۔ کچھ صحافی قائدِ اعظمؒ کے پاس آئے اور اُن سے پوچھا کہ آپ نے اخبارات میں یہ خبر پڑھی ہے؟ آپ لے کہا کہ ہاں پڑھی ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ کے نزدیک یہ واقعہ صحیح ہو سکتا ہے یا محض پراسینڈہ ہے؟ آپ نے کہا کہ یہ صحیح ہو سکتا ہے۔ پوچھا کہ پھر سانپ کے اس طرزِ عمل کی آپ کے نزدیک توجیہ کیا ہے؟ فرمایا \_\_\_\_\_ PROFESSIONAL ETIQUETTE \_\_\_\_\_ یہ جواب وہ ہے جس کا لطف تو لیا جاسکتا ہے، تشریح نہیں کی جاسکتی۔ تشریح کرنا ایسا ہی ہو گا جیسے خوشبو کی تلاش میں پھول کی پتی کو مسل کر رکھ دیا جائے۔ یہ دو لفظ ملک کی ساری فضا میں پھیل گئے۔ "بہاتا گاندھی" پر اس سے کیا گزری ہوگی، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ تھی اس مردِ آہن کی جس لطیف اور ذوقِ شگفتگی۔

اب ہم زندگی کی اس شاہراہ کی طرف آتے ہیں جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں وہ گھاٹیاں آتی ہیں جن میں بڑے بڑے بڑوں تک کے پاؤں بھی پھسل جاتے ہیں لیکن قائدِ اعظمؒ اس دشوار گزار اور ملوث راستے سے بھی پاکیزہ پاگزر گئے۔ اس راستے کا تعلق جنسیات سے ہے۔ قائدِ اعظمؒ کی پہلی شادی ان کے والدین نے ان کے بچپن کے زمانے میں کر دی تھی اور وہ بیوی جلد

ی فوت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ۴۴ سال کی عمر تک شادی نہیں کی اور ان کا یہ تمام عہد شباب سپیدہ سحر کی طرح بے داغ گزرا، درآنحالیکہ دولت، شہرت، قابلیت کے لحاظ سے بھی ان کا شمار ممتاز ترین شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ اور اس کے علاوہ مردانہ حسن و رعنائی میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ بہتی میں پارسیوں کا ایک ممتاز ترین اور متمول ترین خاندان تھا جس کے سربراہ، سر ڈنشا پیٹٹ، کی اکلوتی لڑکی رتن بانی، حسن سیرت و صورت میں بے مثال تھی۔ یہ دونوں شادی پر رضامند ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ سر ڈنشا، ایک مسلمان کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی پر کس طرح رضامند ہو سکتے تھے؛ لیکن بیٹی کے اصرار پر بالآخر انہیں رضامند ہونا پڑا۔ معاملہ یوں طے پا گیا تو ”مسٹر جناح“ نے یہ شرط عائد کر دی کہ لڑکی کو پہلے اسلام قبول کرنا ہوگا، تب شادی ہو سکے گی۔ اس پر سر ڈنشا کے خاندان میں کبرام مچ گیا اور صاف نظر آتا تھا کہ اس شرط پر اصرار سے یہ رشتہ استوار نہیں ہو سکے گا۔ آجکل کی اصطلاح میں اسے ”نو میرج“ سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہ شادی (سول میرج) کے طریق سے بھی انجام پاسکتی تھی۔ لیکن مسٹر جناح اپنی شرط پر قائم رہے اور شادی نہیں کی جب تک مس رتن بانی نے اسلام قبول نہیں کر لیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مسٹر جناح ہنوز قائد اعظم نہیں بنے تھے۔ فقط مسٹر جناح تھے۔

یہی وہ شادی تھی جس کے خلاف ہمارے ہاں کے ”حکومت الہیہ“ کے قیام کے مدعیوں نے یہ افتراء پھیلا یا تھا کہ بے

اک کافر کے واسطے اسلام کو چھوڑا یہ قائد اعظم ہے کہ ہے کافر اعظم اس رفیقہ حیات کے انتخاب کے سلسلہ میں اور بھی کئی عناصر کار فرما ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ حق گوئی اور بیباکی کی وہ خصوصیت تھی جو خود قائد اعظم کے کردار کا بنیادی حصہ تھی۔ اس کی شہادت ہمیں اس واقعہ سے ملتی ہے۔

۱۹۲۱ء کا ذکر ہے کہ مسٹر اور مسز جناح اس زمانے کے وائسرائے (لارڈ ریڈنگ) کے ساتھ لنچ تناول فرما رہے تھے۔ دوران گفتگو وائسرائے نے مسز جناح سے کہا کہ وہ جو مہنی جانا چاہتے ہیں لیکن ایسا کر نہیں سکتے، مسز جناح نے کہا کہ کیوں؟ وائسرائے نے جواب دیا کہ اس لئے کہ وہاں کے لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔ اس پر مسز جناح نے کھٹ سے کہا کہ پھر آپ یہاں کیسے تشریف لے آئے ہیں؟

عور فرمائیے کہ کیا یہ خود مسٹر جناح کی صدائے بازگشت نہیں؟

## سحر فرنگ

مسٹر جناح ۱۹۲۹ء میں وفات پا گئیں اور اس کے بعد قائد اعظم نے بقیہ ساری زندگی تھرو میں گزار دی۔ اس دوران میں انہیں کس کس قسم کی آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا۔ اس کی ایک مثال حال ہی میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ تقسیم ہند کی گتھی سلجھانے کے لئے سب سے آخر لارڈ ماؤنٹ بیٹن آیا تھا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی ایڈوینا بھی تھی۔ نظر بظاہر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ یورپین ممالک کی بیویاں زندگی کے ہر شعبہ میں خاوندوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ اس لئے اس وقت اس طرف کسی کا خیال تک بھی نہیں جاسکتا تھا کہ یہ ”محترمہ“ کوئی خاص مشن لے کر آئی ہیں۔ عمر کے اعتبار سے وہ پینتالیس سال کی تھی لیکن اس کے حسن و جمال، اس کی رعنائیوں اور زیبائیوں، اس کی عشوہ بازیوں اور سحر طرازیوں کے چرچے عام تھے اور یہی تھے وہ ریشمی جال جنہیں اپنے ساتھ لے کر وہ انڈیا آئی تھی۔ اس کا کسی کو پتا ہی نہ چلتا اگر وہ رچرڈ ہوگ کی مرتب کردہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سوانح عمری شائع نہ ہوتی۔ اس میں اس جادوگرنی کے حیرت انگیز کرتب سامنے آئے ہیں۔ اس میں لکھا ہے:-

اس زمانے میں جب ہندوستانی عورتوں کا سیاست میں کچھ نمایاں عمل دخل نہیں ہوتا تھا، مسئلہ تقسیم ہند کی گفت و شنید کے لئے سجو (انگریز) اربابِ صل و عقد یہاں آئے تھے ان کی بیویوں نے اس باب میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس میں سرفہرست ایڈوینا تھی۔ اس کی سحر طرازیوں کا اولین ہدف جو اہر لال نہرو تھا۔ وہ مجرّد تھا اور ایک عورت کی رفاقت سے محرومی کو شدت سے محسوس کرتا تھا۔ ایڈوینا نے اس راز کو بہت جلد پایا۔ یوں تو اس ساحرہ نے ہندوستان کے سب لیڈروں کو مسحور کیا، لیکن نہرو کے ساتھ اس کے تعلقات بڑے گہرے ہو گئے۔ ان تعلقات نے انتقالِ اقتدار کے مسئلہ پر گہرا اثر ڈالا۔ ماؤنٹ بیٹن کو یہ سب کچھ معلوم تھا لیکن اس کا اس نے قطعاً بڑا نہ منایا۔ اس کے برعکس وہ اس پر فخر کرتا تھا اور اپنی بیوی کو اس کی داد دیتا تھا اور اس سے کہتا تھا کہ تم نے کمال کر دکھایا! اسے بھی پیش نظر رکھئے کہ

ایڈوینا کی رگوں میں یہودی خون بھی تھا۔

حتیٰ کہ گاندھی بھی اس ساحرہ کے جادو سے متاثر ہو گیا اور بہت جلد اسے "میری پیاری دوست" کہنے لگ گیا، اگرچہ ایڈوینا کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت نہرو کے ساتھ اس کے تعلقات سے مختلف تھی، ماؤنٹ بیٹن نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا اور ایک ہی نشست میں گاندھی کو رام کر لیا۔ آپ اس جادو گرئی کے "حصار" سے باہر نکل آئیے اور فخر و مباہات سے HOUGH کے اس اعتراف کو پڑھتے کہ "اس سارے جہوم میں اگر کسی پر اس ساحرہ کے جادو کا کوئی اثر نہ ہو تو وہ قائد اعظم محمد علی جناح تھا" اس کے بعد مصنف لکھتا ہے کہ لارڈ بٹلر نے (جو کسی زمانے میں وزیر ہند رہ چکا تھا) کہا ہے کہ

ماؤنٹ بیٹن، جناح کے متعلق صحیح اندازہ لگا ہی نہیں سکا۔ یہ اس کی بڑی غلطی تھی۔ اصل یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا اندازہ نہیں لگا رہا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو اور گاندھی کے ساتھ جس قسم کے تعلقات وابستہ کر لئے، جناح اسے کس قدر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ (ہیں ان امور کا صحیح صحیح اندازہ کرنا چاہیے تھا کیونکہ) جناح وہ واحد شخص تھا جس کے ہاتھ میں ہندوستان کے مستقبل کی کلید تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا کہ اس نے جناح کے ساتھ بھی وہی حربے استعمال کرنے چاہئے جن سے اس نے گاندھی اور نہرو کو رام کر لیا تھا، لیکن وہ اس میں یکسر ناکام رہا۔ جناح میں قطعاً لچک نہیں تھی۔ اس کا ایک ہی خواب تھا اور وہ تھا ایک جداگانہ مسلم سٹیٹ کا قیام تقسیم سے متعلق گفتگو کی مجال میں وہ آتا تو ایک لفظ کہے بغیر محض اس کی آد سے تمام شکر کائے محفل پر سکتے طاری ہو جاتا۔ اپنے اصولوں کا پکا قطعاً نہ جھکنے والا اس سے بات کرنا آسان کام نہ تھا۔ (بالآخر ہمیں اس کے سامنے جھکنا پڑا)۔

آخر میں چند الفاظ اس اعتراض کی تردید میں کہ پاکستان سربراہیہ داروں اور جاگیر داروں کے مفاد کے تحفظ کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ "قائد اعظم اور معاشی مسئلہ" ایک مستقل موضوع ہے جس کے



متعلق بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن میں اس مقام پر اس کی صرف دو ایک مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

۲۲۔ ۱۹۴۳ء میں جنگِ پاکستان اپنی انتہائی شدت پر پہنچ چکی تھی مصلحت کا تقاضا تھا کہ اس وقت بڑے بڑے متمول شہکار کو اپنے ساتھ رکھا جائے۔ ۱۹۴۳ء میں دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا خاص اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے صدارتی خطاب کے دوران قائد اعظم نے فرمایا:-

## سرمایہ دار اور جاگیر دار

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز بلیسی نظام کی رُو سے جو انسان کو ایسا بد مست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پینے کی کمانی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصود ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رستی باقی ہے تو انہیں زلزلے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔

انہوں نے یکم مارچ ۱۹۴۵ء کو مسلم لیگ ورکرز سے کلکتہ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:- میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اتنا دے رکھا ہے کہ میں اپنی اس بڑھاپے کی زندگی کو نہایت آرام و سہولت سے گزار سکتا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں دن رات بھاگے بھاگے پھروں اور اپنا خون پسینہ ایک کر دوں۔ میں یہ تک و تا سرمایہ داروں کے لئے نہیں کر رہا۔ میں یہ محنت شاقہ آپ غریبوں کے لئے کر رہا ہوں۔ میں نے ملک میں درد انگیز مفلسی کے مناظر دیکھے ہیں۔

ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان میں ہر فرد خوشحالی کی زندگی بسر کر سکے۔

آخر میں میں اس خطاب کو نہایت حسین اور دلآویز مقطع پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک کسی شخص کے کردار میں کندن کی سی صلابت اور بیرے کی سی درخشندگی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر سیرتِ محمدیہ کی شمع نورانی سے کسبِ ضیاء نہ کیا ہو۔ قائدِ اعظمؒ کی سیرت کی تابندگی بھی اسی کی رہیں منت تھی۔ حضورؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ ان کی شیفتگی کا کیا عالم تھا اس کی مثال ہمیں اس زمانے میں ملتی ہے جب ان کی عمر ہنوز سولہ سترہ سال کی تھی۔ وہ بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان گئے تو سوال یہ سامنے آیا کہ وہ کس درس گاہ میں داخلہ لیں۔ انہوں نے ۱۹۲۷ء میں کراچی بار ایسوسی ایشن کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

میں نے بالآخر "سکنز ان" میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہ اس لئے کہ اس کے بڑے دروازے پر دنیا کے ممتاز ترین متقنین کی جو فہرست کندہ تھی اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی بھی شامل تھا۔  
(بیکٹر بولیتھو)

## حضورؐ کی ذاتِ اقدس عقیدت

۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی مجلس دستور ساز سے خطاب کرتے ہوئے لارڈ ماونٹ بیٹن نے ناصحانہ انداز میں کہا کہ مجھے امید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے اسی قسم کی رواداری اور حسن سلوک کا ثبوت دیا جائے گا جیسا شہنشاہِ اکبر نے روار کھا تھا۔ یہ سن کر قائدِ اعظمؒ نے جھٹ سے جواب دیا کہ غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کے لئے ہمیں کسی اکبر کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہمارے سامنے ہمارے رسولِ مقبولؐ کا اسوۂ حسنہ ہے جنہوں نے عیسائی اور یہودی اقلیتوں سے ایسی کشادہ نظری کا برتاؤ کیا تھا جس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملے گی۔ ہم اس رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کریں گے۔

وہ رسولِ مقبول جن کی شان میں کراچی بار ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کی جشنِ میلادِ النبیؐ کی تقریب میں قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ

آج ہم یہاں دنیا کی عظیم ترین ہستی کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ حضور کی عزت و تکریم کروڑوں مسلمان ہی نہیں کرتے بلکہ دنیا کی تمام عظیم شخصیتیں آپ کی بارگاہ میں سر جھکاتی ہیں۔ میں ایک عاجز ترین، انتہائی خاکسار بندہ ناچیز ایسی عظیم، بلکہ عظیموں کی بھی عظیم ترین ہستی کو بھلا کیا اور کیسے نذرانہ عقیدت پیش کر سکتا ہوں۔ رسول اکرم عظیم مصلح تھے، عظیم واضع قوانین تھے، عظیم سیاستدان تھے، عظیم حکمران تھے، عظیم ترین راہنما تھے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

یہ ہیں قائدِ اعظم کی اس عظمت کروار اور رعنائی سیرت کی چند جھلکیاں جن کے بل بوتے پر انہوں نے بے تیغ و سناں، چومکھی لڑائی لڑ کر ایک عظیم مملکت حاصل کر لی۔ تاریخ عالم کا یہ یقیناً ایک منفرد واقعہ ہے۔

طاب لہ وحسن مآب

شادابیوں اور کامرانیوں کی اس قسم کی پرسترت داستان کے بعد میں آپ کی آنکھوں کو غم کے آنسوؤں سے نم آلود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن

دل کا خوں آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج؟

نالہ رو کا ہٹا کہ یہ پردہ دیر راز نہ ہو

مجھے جب بھی حالات مابعد کے تناظر میں ان حسین خوابوں کی یاد آتی ہے جو میں نے سوتے میں نہیں جاگتے میں دیکھے تھے تو دل سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور بے ساختہ زبان پر آ جاتا ہے کہ

ویراں ہے میکدہ خم و ساغراؤ اس میں!

تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے!

پروین (جنوری ۱۹۸۱ء)

غالب و کار آفرین کار کشا، کار ساز  
اُس کی ادا و فریب اس کی نگہ دل نواز  
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

(اقبال - بال جبریل ص ۱۳۲)

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ  
اس کی امیدیں قلیل، اسکے مقاصد جلیل  
رزم دم گفت گو، گرم دم جستجو

# پیامِ قائدؒ

ہو س نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو  
 اخوت کا بیباں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا  
 غبارِ آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پیر تیرے  
 تو اے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا  
 مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر  
 شبستانِ محبت میں حریر و پر نیاں ہو جا  
 گذر جا بن کے سبیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے  
 گستاخاں راہ میں آئے تو جوتے نغمہ خواں ہو جا  
 (اقبالؒ - بانگِ درا ص ۳۱۲)

# کیا

## قائدِ اعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟

۱۹۷۹ء میں محترم محمد منیر (ریٹائرڈ) چیف جسٹس آف پاکستان کی کتاب FROM JINNAH TO ZIA شائع ہوئی تھی۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے اس سابقہ خیال کو دہرایا ہے کہ قائدِ اعظم پاکستان میں سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں روزنامہ "پاکستان ٹائمز" میں ایک مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "DAYS TO REMEMBER" اس کے آخر میں انہوں نے لکھا تھا:-

تشکیلِ پاکستان کے وقت کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی۔

طلوعِ اسلام بابت اگست-ستمبر ۱۹۴۳ء میں اس کا مواخذہ کیا گیا تھا۔ میں نے محترم جسٹس کی کتاب کو درخورِ اعتنائہ سمجھا کیونکہ میرے خیال میں یہ بات کہنا کہ قائدِ اعظم پاکستان میں سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے ایسا ہی ہے کہ جیسے کل کو کوئی مورخ یہ لکھ دے کہ قائدِ اعظم ننگوٹ باندھ کر مسٹر گاندھی کی پرارتھنا میں جایا کرتے تھے۔ یعنی بدیہیات کو جھٹلانا۔

لیکن میرے ایک بالغ نظر دوست نے مجھ سے کہا ہے کہ محترم جسٹس کی اس کتاب سے پاکستان کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے۔ وہ طبقہ جو شروع ہی سے پاکستان کے خلاف تھا، ہمارے نوجوان طبقہ میں یہ خیال عام کر رہا ہے کہ قائدِ اعظم کا مقصد اس مملکت کو سیکولر بنانا تھا۔ اس کی تائید میں وہ محترم جسٹس کی کتاب

کو بطور سند پیش کرتا ہے۔ اور چونکہ محترم جسٹس کے نام کو ان کے سابقہ منصب اور بزرگی کے اعتبار سے خاص اہمیت حاصل ہے اس لئے یہ پروپیگنڈہ خاصا اثر انداز ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس طبقہ میں یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ جب پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا مقصود تھا تو ہندوستان سے الگ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے دوست نے مجھ سے کہا کہ اس کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا۔ ان سطور کا جذبہ محرکہ یہی ہے۔ میں اس سلسلے میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تحریک پاکستان کے سلسلے میں بالعموم اور قائد اعظم کے ضمن میں بالخصوص جو کچھ میں کہتا چلا آ رہا ہوں اور کہوں گا، وہ شنید نہیں، وید ہے۔ میں (اپنے متعلق اکثر کہا کرتا ہوں کہ میں) ۱۹۳۰ء کا پاکستانی ہوں جب علامہ اقبالؒ نے (الہ آباد کے مقام پر) اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا کہ اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اپنی آزاد مملکت میں بن سکتا ہے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے مسلمانان ہند کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا تھا۔ اس کے بعد جب قائد اعظمؒ اس شمع کو لے کر آگے بڑھے تو میں نے ملازمت میں ہونے کے باوجود تقریباً دس سال تک ان کی معیت اور قیادت میں اپنے انداز سے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ اس زمانہ کے طلوع اسلام کے فائل اس کے شاہد ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد طلوع اسلام ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا اور وہ پاکستان کی اصل اساس کے تحفظ کے سلسلہ میں جس کثرت اور شدت سے لکھتا چلا آ رہا ہے شاید ہی کوئی پاکستانی ایسا ہو جو اس سے ناواقف ہو۔ بنا بریں میں اس سلسلہ میں جو کچھ عرض کروں گا وہ شنید نہیں، وید ہوگا۔ لیکن "وید" سے یہ مراد نہیں کہ میں زبانی روایات پیش کروں گا۔ بلا سند روایات سے تو تاریخ نسخ ہو جاتی ہے۔ میں جو کچھ کہوں گا وہ قائد اعظمؒ کے ان بیانات اور تقاریر پر مبنی ہوگا جو چھپ کر محفوظ ہو چکی ہیں اور انہیں ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے۔

محترم جسٹس نے اپنے دعویٰ کو ان الفاظ میں سمیٹ کر بیان کیا ہے :-

۱۔ قائد اعظمؒ سیکولر ڈیموکریٹک مملکت چاہتے تھے۔ یعنی ایسی سٹیٹ جس میں مذہب کو کاروبار

مملکت سے کچھ واسطہ نہ ہو۔ (ص ۳۲)

۲۔ پاکستان میں ایک مذہبی مملکت کے قیام کا خیال نہ علامہ اقبالؒ کے ذہن میں تھا نہ قائد اعظمؒ کے۔

۳۔ اسلامی مملکت کا تصور قائد اعظم کی وفات کے بعد پہلی بار ۲۵ مارچ ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خاں (مرحوم) نے قرارداد مقاصد کی شکل میں اسمبلی میں پیش کیا۔ انہوں نے اس قرارداد کو قائد اعظم کی زندگی میں اس لئے پیش نہ کیا کہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس کی سخت مخالفت کریں گے۔ (ص ۳۶) اپنے اس دعوے کی تائید میں محترم نے دو دلائل پیش کئے ہیں :-

- ۱۔ قائد اعظم نے بار بار کہا تھا کہ پاکستان میں تھیا کریسی نہیں ہوگی (ص ۳۲، ص ۳۵) اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سیکولرٹیٹ چاہتے تھے۔
- ۲۔ انہوں نے اپنی ۱۱ اگست ۱۹۴۶ء کی تقریر میں اسے واضح کر دیا تھا کہ پاکستان کی مملکت سیکولر ہوگی۔ (ص ۳)

قبل اس کے کہ میں واضح کروں کہ قائد اعظم پاکستان میں کس قسم کی سٹیٹ چاہتے تھے۔ میں جسٹس مدوح کی بزرگی کے احترام کے باوجود اتنا گزارش کرنے پر مجبور ہوں کہ ان کی یہ دلیل کہ چونکہ قائد اعظم تھیا کریسی نہیں چاہتے تھے اس لئے اس سے ثابت ہوا کہ وہ سیکولرٹیٹ چاہتے تھے، ریکارڈ اور بودی ہے۔ تھیا کریسی اسی طرح خلاف اسلام ہے جس طرح سیکولرزم۔ لہذا قائد اعظم جس طرح سیکولرزم کے خلاف تھے، اسی طرح تھیا کریسی کے بھی خلاف تھے۔ تھیا کریسی کہتے ہیں، اسے انہوں نے اپنے اس پیغام میں واضح کر دیا تھا جو انہوں نے بحیثیت گورنر جنرل فروری ۱۹۴۸ء میں اہل امریکہ کے نام براڈ کاسٹ کیا تھا۔ اس میں انہوں نے پاکستان کے دستور کے متعلق فرمایا تھا :-

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئین پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ امر مسلم ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیا کریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے

دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(اقتاریہ بحیثیت گورنر جنرل، ص ۶۵)

## تھیاکریسی کی مخالفت

اس براڈ کاسٹ کے آخری فقرہ میں قائد اعظم نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ تھیاکریسی وہ نظام حکومت ہوتا ہے جس میں اقتدار مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ قائد اعظم اس طرز حکومت کے خلاف تھے کیونکہ یہ اسلام کے خلاف ہے اور قرآن آیا ہی اسے مٹانے کے لئے تھا۔

مجھے انتہائی افسوس بلکہ دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ محترم جسٹس نے اپنی کتاب میں قائد اعظم کے اس براڈ کاسٹ کو نقل کیا ہے لیکن اس فقرہ تک کہ ”ہم ان کا پورا پورا احساس رکھتے ہیں“ اس کا اگلا فقرہ جس میں قائد اعظم نے واضح کیا تھا کہ تھیاکریسی کیا ہوتی ہے انہوں نے حذف کر دیا ہے۔

(کتاب ص ۳، ص ۳)

ان کی بزرگی کا احترام ہمیں اس باب میں کچھ کہنے سے منع ہے۔ عدالت کی میزان میں اسے کیا کہا جائے گا، اس کے متعلق ان سے بہتر فیصلہ اور کون دے سکے گا؟

اقبال کی طرح قائد اعظم بھی تھیاکریسی کے خلاف تھے اور سخت خلاف۔ اس لئے کہ تھیاکریسیٹ اور اسلامک سیٹ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ علامہ اقبال نے تھیاکریسی کے خلاف کیا کچھ اور کتنا کچھ لکھا تھا، اس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ (میں اس مقالہ کو جسٹس ممدوح کی کتاب کے حوالے سے قائد اعظم تک محدود رکھنا چاہتا ہوں) یہاں ان کے صرف ایک بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اور جس میں انہوں نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

تہارے دین کی یہ عظیم شان بلند نظری، ملاؤں اور فقہوں کے فسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک ایسے قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی



بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

انہوں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس قسم کا انقلاب بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی ہوگا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ ”اسلامی دنیا اس کی طرف عمر کی ریح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمر جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرات نصیب ہوئی کہ ”حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ“ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔“ (خطبات اقبال)

قائد اعظم نے ۵ فروری ۱۹۳۸ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے نوجوان طالب علموں سے کہا تھا کہ ”مسلم لیگ نے ایک کام تو کر دیا اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں..... رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پرست کھیل کھیل رہے ہیں وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس نے تمہیں اس ناپسندیدہ عنصر کی جگہ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔“ (تقاریر قائد اعظم، حصہ اول ص ۴۸) اس سے ان کی مراد تھیا کریسی کی مخالفت تھی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے ۱۱ اپریل ۱۹۳۶ء کو دہلی میں مسلم پیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ جنگ کر رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین تھیا کریسی نہیں۔ ہم تھیا کریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔

(تقاریر جناح، شائع کردہ شیخ محمد اشرف، جلد دوم، ص ۳۸۶)

## اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیات

وہ تھیا کریٹک سٹیٹ نہیں بلکہ اسلامک سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اسلامک سٹیٹ کے اصول و مبانی کیا ہوتے ہیں یہ موضوع بڑی تفصیل چاہتا ہے (ہیں اس کے متعلق صدہا صفحات لکھ چکا ہوں) اس کا نقطہء ماسکہ یہ ہے کہ اس میں کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو انہوں

نے حیدرآباد (دکن) میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کو ۱۹۴۱ء کو انٹرویو دیتے ہوئے ایسے جامع انداز میں سمٹا کر بیان کر دیا تھا جس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ انہوں نے فرمایا تھا:۔  
اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں شرعی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(اورینٹ پریس بحوالہ روزنامہ انقلاب لاہور، مورخہ ۸ فروری ۱۹۴۲ء)

ہمیں امید ہے کہ اس سے محترم جسٹس پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قائد اعظمؒ تھیا کریسی کی مخالفت کے بعد کس قسم کا سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔

## مطالبہ پاکستان کا مقصد

اب آئیے اس حقیقت کی طرف کہ وہ مقصد کیا تھا جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا اور قائد اعظمؒ اور مخالفین مطالبہ پاکستان کے مابین جنگ کس بات پر ہوئی تھی؟ وہ جنگ صرف اس بنا پر لڑی گئی تھی کہ قائد اعظمؒ اسلامی ریاست متشکل کرنا چاہتے تھے اور مخالفین پاکستان (ہندو اور مسلمان نیشنلسٹ) سیکورٹیٹ کے حامی تھے۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی وسعت طلب ہے۔ میں چند ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ قائد اعظمؒ نے جب مذہب (دین) کی بنیادوں پر مملکت قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا تو (اس زمانے کے) کانگریس کے ایک نامور لیڈر مسٹر بھولا بھسانی ڈیسائی نے ایوان اسمبلی میں (جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے) پکار کر کہا:۔

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظام حکومت قائم کیا جاسکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ وقت آچکا ہے کہ ہم اعتراف کریں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کریں کہ ضمیر مذہب

اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظام حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصر حاضر میں بہترین نظام حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔

(ہندوستان ٹائمز ۱۹۳۸ء، ۹/۵)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا تھا:

حکومتِ الہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعلِ بعثت ہو گا اگر وہ ہندوستان جسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامتِ خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذریعہ رہنا اس سدا ب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔

(ہندوستان ٹائمز، ۳۹-۱۱-۱۳)

۱۹۴۰ء میں جب قرارِ دہلی پاکستان منظور ہوئی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر گاندھی نے کہا تھا:

اگر مذہب کو علیٰ حالہ رہنے دیا جائے یعنی ایک سنج کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہ عمل بھی مشترک ہو۔

(ہندوستان ٹائمز، ۳۰-۴-۱۹)

اس رو میں مسٹر گاندھی نے ۱۹۴۶ء میں لکھا تھا:

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا، مجھے میرے مذہب کی قسم میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے حکومت کو اس سے کیا واسطہ؟ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا

خیال رکھے..... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، مذہب ہر شخص کا  
پرائیویٹ معاملہ ہے۔ (ہریجن، ۱۹۴۶ء، ۱۲-۹)

مسٹر گاندھی کا یہ ردِ عمل، قائد اعظم کے اس خط کا نتیجہ تھا جو انہوں نے اول الذکر کو یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو  
لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے مسٹر گاندھی سے کہا تھا:-

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا  
عنصر ہے۔ لیکن خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور  
وہ کون سی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست  
یا عمرانی اصلاح؟ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے (لہذا، مذہب اور  
سیاست دو الگ الگ شعبے ہونے لگتے) آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور  
خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے جس مذہب کو  
انسانی معاملات سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب  
انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال  
اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ  
زندگی انسانی نہیں، محض غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شوہ  
و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔ (تقاریر جناح، حصہ اول، ص ۱۲۹-۱۳۰)

## قرآن مجید کی عظمت

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قائد اعظم نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اسلامی مملکت وہ ہے جس میں  
قرآنِ عظیم کی حکمرانی ہو۔ انہوں نے قرآن مجید کی عظمت اور جامعیت کا کسی ایک بیان میں ذکر نہیں کیا وہ  
پوری تحریکِ پاکستان کے دوران اس حقیقت کو دہراتے رہے۔ مثلاً اپریل ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے۔ صوبہ سرحد  
کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائد اعظم سے ایک پیغام کے لئے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں  
فرمایا:-

تم نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں جبکہ ہمارے

پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہنمائی اور بصیرت افزائی کے لئے کافی ہے۔ وہ پیغام ہے خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم۔  
(تقاریر، جلد اول، ص ۵۱۶)

۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء کو آپ نے قوم کے نام عید کا پیغام نشر فرمایا۔ اس زمانے میں ملک میں ہنگامے اور فساد ہو رہے تھے۔ آپ نے قوم سے کہا:-

جب ہمارے پاس قرآن کریم ایسی مشعل ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے؟  
(تقاریر، جلد اول، ص ۵۱۷)

دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے خود ہی یہ سوال اٹھایا:-

وہ کون سا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں؟ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟ وہ کون سا سنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا:-

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ سنگر، خدا کی عظیم کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔

ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول، لہذا ایک قوم۔  
(تقاریر، جلد دوم، ص ۵۱۸)

انہوں نے ۱۹۴۵ء میں ملت کے نام عید کے پیغام میں ایک ایسی حقیقت کشا بات کہی جس پر نگہ بصیرت ہمیشہ وجد کرتی رہے گی۔ آپ نے فرمایا:-

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حد تک محدود نہیں۔ مشہور مورخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بحر اطلانتک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطہ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے

قوانین نوع انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل، منشاء خداوندی کے مظہر ہیں۔

اس کے بعد قائد اعظم فرماتے ہیں:-

اس حقیقت سے سولے جہلدار کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطہ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی تقاریب ہوں یا روزمرہ کے معمولات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا، عام اخلاقیات ہوں یا جرائم، دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا، ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرم نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت نہیں)۔

(تقاریر، جلد دوم، ص ۳)

حیدرآباد (دکن) کے جس انٹرویو کا ذکر پہلے آچکا ہے اس میں جب طلباء نے یہ سوال کیا کہ "مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟" تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا:-

جب میں انگریزی زبان میں مذہب RELIGION کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کی رُو سے میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں۔۔۔۔۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلا۔ نہ مجھے دنیاویات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلام کے

لے ہمارے ہاں دقت یہ پیش آجاتی ہے کہ قرآن کریم میں اسلام کے لئے دین کا لفظ آیا ہے اور لفظ دین کے لئے انگریزی زبان میں کوئی لفظ نہیں ان کے ہاں صرف RELIGION کا لفظ ہے جس کے معنی مذہب میں دین نہیں۔

مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن مجید کی اصولی ہدایات اور طریق عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

انہوں نے اپنی اس پکار کو اس شد و مد سے دہرایا کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اس سے واقف ہو گیا کہ قائد اعظم کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے ہیں۔

## دشمنوں کی گواہی

یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لہریا میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور رہنما سٹرنٹشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:۔  
 تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنا لیں جہاں طرز حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اردوان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر ایلوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطہ ارض ہو گا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

(ٹریبیون، ۱۹۴۱ء، ۱۱۔ ۱۲)

ضمنیاً۔ اوائل ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے۔ جرمنی میں پاکستان ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام قائد اعظم کے جشن صد سالہ کی ایک تقریب منائی گئی۔ اس میں ایک جرمن سکالر، پروفیسر ڈاکٹر KRAHNAN نے اپنی تقریر کے دوران کہا تھا۔

قائد اعظم محمد علی کے سامنے باڈل، قرآن مجید تھا۔ (پاکستان ٹائمز، ۳ فروری ۱۹۴۷ء)  
 یعنی بھارت کے سٹرنٹشی اور جرمنی کے سکالرز تک تو جانتے تھے کہ قائد اعظم کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے

تھے، لیکن نہیں جانتے تھے تو ہمارے محترم جسٹس محمد منیر صاحب۔

بوٹا بوٹا پتہ پتہ حال ہمارا جانے ہے

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

قائد اعظم کی وفات کے بعد ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے مقالہ  
افتتاحیہ میں لکھا تھا:-

پاکستان بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے  
پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے رہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا  
ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت  
قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے کہا:-

اگر کشمیر کا مسئلہ پُر امن طریقے سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی سٹیٹ کے  
خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین  
رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات  
کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

کیا محترم جسٹس منیر صاحب نے اندازہ فرمایا ہے کہ قائد اعظم اور مخالفین میں باعث نزاع کیا مسئلہ  
تھا؟ یہ مسئلہ کہ قائد اعظم اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے اور مخالفین سیکولر سٹیٹ پر زور دیتے تھے۔  
جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہندو تو اس کے لئے بھی تیار تھا کہ اگر پاکستان اسلامی سٹیٹ بنانے کے  
دعوے کو ترک کر دے تو وہ اس کے ساتھ مفاہمت کر لے گا۔

ہم نے پہلے کہا ہے کہ قائد اعظم کی طرف سے پیش کردہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت ہندو نے بھی  
کی تھی اور قومیت پرست مسلمان لیڈروں نے بھی۔ ان میں سر فہرست نیشنلسٹ علماء کا طبقہ تھا۔ اگر ان  
کی بناء مخالفت سامنے آجائے تو اس سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قائد اعظم کس قسم کی مملکت قائم  
کرنا چاہتے تھے اور ان کے مخالفین کس قسم کی؟ یہ مخالف علماء، باستانا، چند دارالعلوم دیوبند کے  
مسک سے متعلق تھے۔ دیوبند کا مسک کیا تھا اس کے متعلق متحدہ ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ



اخبار "مدینہ" (بکنور) کی ۷ اپریل ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں مولانا سر آرمہد آزاد دیوبندی کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا:

یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علماء ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

یہ ایک مثال ہی اس حقیقت کے ثبوت کے لئے محکم دلیل ہے کہ یہ لوگ سیکولر حکومت کے قائل تھے اور قائد اعظم اس طرز حکومت کے مخالف اور یہی دونوں میں بنا رہی مخالفت تھی۔ سیکولر نظام حکومت سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں ہر اہل مذہب کو اعتقادات، عبادات، رسوم و رواج اور شخصی قوانین (پرسنل لاز) کی آزادی حاصل ہو اور امور مملکت میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو۔ یہ تھی وہ سیکولر حکومت جس کے واعی نیشنلسٹ علماء تھے۔ اُس زمانے میں اس گروہ کے سرخیل 'دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیت العلماء ہند کے صدر (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے۔ ان کا ارشاد تھا:

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں حاصل کرنے کے لئے سب کو متحدہ کوشش کرنی چاہیے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام میں اس آزادی کی اجازت ہے۔

(زمزم، مورخہ ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

وہ فرماتے تھے:-

کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔

(مولانا مدنی کا پمفلٹ، متحدہ قومیت اور اسلام، ص ۶)

اس کے برعکس جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، قائد اعظم کا موقف یہ تھا کہ اسلام میں مملکت کی بنیاد مذہب پر ہوتی ہے، اس لئے ان علماء کا یہ مسلک اسلام کے خلاف ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت      نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

قائدِ اعظم اور ان علماء کے اختلاف کی شدت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا تھا اور مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دے دیا تھا۔ اس فتویٰ کا جواب (مولانا) شبیر احمد عثمانی نے اپنے ایک مکتوب میں دیا تھا۔ (زہیر و کن "۱۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء)۔

## ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر

اب آئیے قائدِ اعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کی طرف جسے یہ حضرات ٹرپ کے پتے کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں اور جس پر محترم جسٹس محمد منیر صاحب نے بھی اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھی ہے اور اتنا کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قائدِ اعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے، بلکہ یہاں تک کہنے میں بھی کچھ باک نہیں سمجھا کہ انہوں نے دو قومی نظریہ کو بھی ختم کر دیا تھا۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ انہوں نے اسلامی مملکت کے تصور کی نفی کر دی تھی، بلکہ سرے سے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا تھا جس پر تقسیم ہند کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ اس تقریر کے سلسلہ میں بات یوں ہوئی کہ جب قائدِ اعظم کو پاکستان کی پہلی مجلس آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے (۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو) اس مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تقریر فرمائی۔ اس میں انہوں نے پہلے قبل از تقسیم کے ہندوستان کے کوائف و حوادث پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر باہمی عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ وہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں، اس لئے وہاں ہمیشہ مسلمانوں کا خون خرابہ ہوتا تھا۔ پاکستان میں صورت حال اس کے برعکس ہوگی۔ یہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے اور ہندو اقلیت میں، اس لئے ہندوؤں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اب یہاں ان کے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو کچھ وہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ویسے بھی ہندو مورخوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کا ایسا بھیانک اور دہشت انگیز نقشہ کھینچ رکھا ہے جس سے ہندو عوام خوف و ہراس سے کانپ اٹھتے ہیں۔

بنا بریں یہاں کا ہندو اس لئے بھی خائف ہو سکتا تھا کہ اب یہاں جو مسلمانوں کی حکومت قائم ہو رہی ہے تو ماضی کی تاریخ کو یہاں بھی دہرایا جائے گا۔ ہم ہندوستان ٹائمز کا اقتباس پہلے درج کر چکے

میں جس میں اس نے کہا تھا کہ پاکستان کے ہندوؤں کے دل میں یہی خطرہ لاحق تھا۔ ان تاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے قائد اعظم نے اپنی تقریر میں ہندوؤں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہوگا انہوں نے جملہ اہل پاکستان کو مخاطب کر کے فرمایا۔

تم آزاد ہو، تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں، یا مملکت پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں۔ تمہاری ذات یا مسلک کچھ بھی ہو، اس کا امور مملکت سے کچھ تعلق نہیں ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ (اور تو اور) انگلستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہاں عیسائیوں ہی کے دو فرقوں — رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ — میں کس قدر کشت و خون ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس مملکت نے اپنی کامل ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے رفتہ رفتہ ان مناقشات کو مٹا دیا اور اب تم پورے انصاف سے کہہ سکتے ہو کہ وہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نہیں، بلکہ ایک مملکت کے شہری بستے ہیں۔ اسی طرح۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہیے کہ ایک وقت کے بعد یہاں نہ ہندو، ہندو رہے گا، نہ مسلمان، مسلمان — مذہبی نقطہ نگاہ سے نہیں، کیونکہ وہ تو ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے۔ ایسا، ان سب کے پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے، سیاسی نقطہ نگاہ سے ہوگا۔

یہ ہیں قائد اعظم کے وہ الفاظ جنہیں سپر بنا کر یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تشکیل پاکستان کے فوری بعد دو قومی نظریہ کو بھی خیر باد کہہ دیا تھا اور اسلامی مملکت کے تصور کی تردید کر کے اسے سیکولر بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اگر قائد اعظم کہیں مریخ سے ٹپکے ہوتے اور انہوں نے پہلے پہل یہ الفاظ کہے ہوتے تو اس تقریر سے اس قسم کے استنباط کا شائبہ ہو سکتا تھا۔ لیکن جس شخصیت کی دس سالہ (تحریک پاکستان کی) زندگی اور اس دوران میں اس کے صد ہا صفحات پر مشتمل بیانات، تقاریر، خطابات ہمارے سامنے ہوں، اس کی طرف ان نتائج کو منسوب کرنا جس قدر زیادتی ہے، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جب ان لوگوں سے اس دلیل کا جواب نہیں بن پڑتا تو وہ (نہایت دیدہ دلیری سے) کہہ دیتے ہیں کہ بے شک قائد اعظم دس سال تک یہ دعویٰ کرتے رہے لیکن وہ درحقیقت ایک وکیلانہ حربہ تھا جسے

انہوں نے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ جب کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تو اس حربہ کی ضرورت رہی۔ ایسا کہنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ وہ یہ کچھ کس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ ہم بر بنائے عقیدت نہیں کہتے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص قائد اعظم کے کیریئر کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، وہ ان کے خلاف اس قسم کا الزام عائد کرنے کی جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔ حق کوئی اور بے باکی ان کے کردار کی ایسی خصوصیت تھی جس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک کو تھا۔ لندن ٹائمز نے ان کی وفات پر لکھا تھا:-

قائد اعظم نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونے کے طور پر پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں، ان میں وہ لچک نہیں تھی جو انگریزوں کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی جیلہ ساری نہیں تھی۔

قائد اعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے جب مجلس آئین ساز سے خطاب کیا تھا تو ملک کے حالات کیا تھے۔ (جیسا کہ محترم جسٹس نے خود اپنی کتاب میں تسلیم کیا ہے) تقسیم ہند کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ اس سے وہاں کے مسلمانوں کے دل میں خوف و دہشت کے ایسے جذبات ابھرے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ پاکستان میں آکر پناہ لے لیں۔ لیکن ان وحشی درندوں نے ان نیتے قافلوں کو بھی نہ چھوڑا۔ راستہ بھر قتل و غارتگری کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ان کی نوجوان لڑکیوں کو ہزاروں کی تعداد میں چھین چھٹ کر لے گئے۔ ان کے معصوم بچوں کو نیزوں کی انہوں پر اچھالا گیا۔ اور تو اور دلی سے جو گاڑیاں خود حکومت کے عملہ کو لے کر روانہ ہوئیں (ہیں بھی انہیں میں شامل تھا) یہاں پہنچنے پر ان میں سے زندہ انسانوں کی بجائے لاشوں کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان وحشیانہ مظالم کا رد عمل پاکستان کے بعض حصوں میں بھی ہوا اور اس سے یہاں کے غیر مسلم باشندوں (بالخصوص ہندوؤں) کے دل میں خوف و ہراس، بے اعتمادی اور بے یقینی کے وساوس پیدا ہوئے۔ آپ سوچئے کہ ایک ایسی مملکت جس کی عمر ابھی ایک دن کی بھی نہ ہوتی ہو اس قسم کے لرزہ خیز

حالات سے دوچار ہو۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کے پاس (ابھی) نہ اپنی فوج ہو، نہ اسلحہ نہ سامان ہو نہ پیسہ، تو اس کے سربراہ کے دل پر اس سے کیا نہ گزرتی ہوگی؟ اس کے ساتھ اسے بھی ذہن میں رکھتے کہ پاکستان کے اندر خود ایسے عناصر موجود تھے جو ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہے تھے اور دوسری طرف انہیں اشتعال بھی دلا رہے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں بیان کر کے وہاں کے مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ کو تیز سے تیز تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے لئے نہایت ضروری تھا کہ یہاں غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں قائد اعظم کو پاکستان میں پہلی تقریر کرنی پڑی۔ قائد اعظم بڑی متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ وہ عام طور پر جذبات سے مغلوب نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن جن حالات سے اس وقت ملک دوچار تھا اور اتنی عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ اس مملکت پر آ پڑا تھا، اس کے سربراہ کا ان سے متاثر ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اسی قسم کی حفاظت ملے گی جیسی مسلمانوں کو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن (پہلے اعتراض ہے کہ وہ اپنے معمول کے خلاف) شدتِ جذبات میں الفاظ کے انتخاب میں کما حقہ احتیاط نہ برت سکے۔ بایں ہمہ ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ جس نظر پر کی رو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریزوں سے جنگ کر کے پاکستان حاصل کیا تھا وہ اسے پہلے ہی دن نذرِ آتش کر دیں گے بڑی زیادتی ہے۔ کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کرے گا۔

آئیے ہم لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھیں کہ قائد اعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا مفہوم خود غیر مسلم اقلیتیں کیا سمجھتی تھیں کیا انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ اس سے قائد اعظم مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا اعلان کر کے سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے یا یہ کہ اس سے مقصود غیر مسلم اقلیتوں کا تحفظ تھا؟..... مسٹر جو شوا فضل الدین ایک مشہور مسیحی لیڈر تھے (ان کا چند سال پہلے ادھر انتقال ہوا ہے)۔ جب صدر ایوب (مرحوم) نے لاکمیشن کا تقرر کیا تو مسٹر جو شوا نے اس سوال پر بحث کی تھی کہ مجوزہ آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا

اس میں انہوں نے پہلے یہ واضح کیا تھا کہ

- ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کی رو سے مملکتِ پاکستان کے دو بنیادی ستون ہیں۔ یعنی.....
- ۱۔ مملکتِ پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہوگی۔ یہی وہ قدر مشترک ہے جو مشرقی اور مغربی بازوؤں میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ اور
  - ۲۔ اقلیتوں کے لئے تحفظات۔

## اقلیتوں کے لئے تحفظات

اس کے بعد مسٹر جوشوا نے کہا تھا کہ مجوزہ آئین کی یہ دونوں شرائط پوری کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد انہوں نے قائدِ اعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء (اور اس کے ساتھ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء) کی تقریر کے اقتباسات دے کر یہ کہا تھا کہ ان کی تعبیر میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نہ ہندو، نہ ہندو رہے نہ مسلمان، بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم تشکیل ہو جس کا لازمی نتیجہ سیکولر انداز حکومت ہو جائے وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:-

یہ کہنا کہ تخلیقِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظمؒ نے \_\_\_\_\_ جو خود اس پاکستان کے خالق تھے \_\_\_\_\_ اپنی پہلی ہی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہے کہ اس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی۔ بالکل پاگل پن ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلا لحاظ مذہبِ ملت ہر ایک کو مساوی حقوق شہریت حاصل ہوں گے۔

## اگست ۱۹۴۷ء کے بعد

اس کے بعد مجھے صرف اتنا اور کہنا ہے کہ اگر یہ تقریر قائدِ اعظمؒ کی زندگی کی آخری تقریر ہوتی تو پھر بھی اس مخالطہ آفرینی کی گنجائش نکل سکتی تھی کہ وہ جو کچھ دس سال تک کہتے رہے تھے آخر میں وہ اس سے تائب ہو گئے تھے۔ اس لئے اب سندن کی آخری تقریر ہی ہو سکتی ہے۔ حسن اتفاق کہ قائدِ اعظمؒ

اس کے بعد بھی ایک سال تک زندہ رہے۔ اور اگرچہ ان کا یہ تمام عرصہ انتہائی نازک بیماری کے عالم میں گزرا لیکن بایں ہمہ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں پھر اس کی وضاحت کر دی کہ پاکستان کس قسم کی سیٹ ہوگی۔ انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہل امریکہ کے نام جو پیغام براڈ کاسٹ کیا تھا اس کا ایک حصہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ انہوں نے اس کے شروع میں کہا تھا:

مملکتِ پاکستان جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین نصب العین کا ایک حد تک حصول ہے، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آگئی تھی۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامک سیٹ اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص ۶۳)

مجھے ایک بار پھر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ محترم جسٹس منیر صاحب نے جس طرح اس براڈ کاسٹ کا وہ حصہ حذف کر دیا تھا جس میں قائد اعظم نے بتایا تھا کہ تھیا کر سی کسے کہتے ہیں اسی طرح انہوں نے اس براڈ کاسٹ کا جو اقتباس اپنی کتاب میں دیا ہے (صفحہ ۳۱-۳۰) اس میں اسلامک سیٹ کے الفاظ بھی درج نہیں کئے کیونکہ یہ ان کے دعویٰ کی ساری عمارت کو منہدم کر دیتے تھے۔

قائد اعظم نے اسی ماہ (فروری ۱۹۴۸ء میں) آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں فرمایا تھا:

مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ان کے درمیان مملکتِ ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرون ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال اُبھرے گا وہ یہ ہوگا کہ (ایسی مملکت کا قیام) کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہوگی میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا جو یہ ہے:

ایسا ہمارے ایمان کی رُو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر، ایمان اپنے آپ پر، ایمان مستقبل پر، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہ سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا:

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جن میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنا بریں، ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات، ہم اپنے اسالیب فکر، نقطہ نگاہ اور احساسِ دروں کے مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص ۵۸)

اگر ہم مملکتِ پاکستان کی بنیاد قرآن مجید پر رکھتے اور اس کی تعلیم کو عام کرتے جاتے تو ہونہیں سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جاتا۔ اس کی بنیاد ہی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم کے رشتے امت و احدہ ہونے کے اصول و نظریہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور وطن اور نسل کی تفریق کے تصور کو عام ہونے دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ تشدد و افتراق تھا۔

”ایمان، ایمان خدا پر ایمان اپنے آپ پر ایمان اپنے مستقبل پر“ یہ تھی وہ اساسِ محکم جس پر مملکتِ پاکستان کی یہ رفیع و عظیم عمارت استوار ہوئی تھی۔ مجھے ایک بار پھر (بصد تائیف) کہنا پڑتا ہے کہ محترم منیر صاحب نے اپنی کتاب میں اس تقریر کا جو اقتباس دیا ہے (ص ۱۲) اس میں وہ حصہ نقل نہیں کیا جس میں ایمان کا ذکر ہے۔ قائد اعظم نے، اپریل ۱۹۴۸ء کو گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں ایک قبائلی جرگہ کے ساتھ گفتگو کے دوران فرمایا:-

ہم مسلمان، ایک خدا، ایک کتاب (قرآن مجید)، اور ایک رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے صف بستہ کھڑے ہونا ہوگا۔

(تقاریر گورنر جنرل، ص ۱۲)

انہوں نے ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو سٹی دربار میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

میرے پیش نظر ہمیشہ اسلامی ڈیموکریسی کا اصول رہا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری سخات کا راز ان سہرے اصولوں کے اتباع میں ہے جنہیں ہمارے مقنن اعظم حضور نبی کریم نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ لہذا ہمیں اپنی ڈیموکریسی کی بنیاد حقیقی اسلامی نظریات اور اصولوں پر رکھنی چاہیے۔

(تقاریر گورنر جنرل، ص ۵۶)



تقسیم ہند کے عواقب میں جب انگریز، ہندو اور سکھوں کی سازش نے ہمارے خلاف قیامت برپا کر دی تھی تو قوم شکستہ خاطر سی ہو رہی تھی عین اس حالت میں آپ نے ۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے قوم کا حوصلہ بندھایا اور کہا کہ یاد رکھو:-

ایسے نامساعد حالات میں بھی اگر ہم نے قرآن مجید سے بصیرت اور رہنمائی حاصل کی تو میں ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ آخر الامر فتح ہماری ہی ہوگی۔

(تقریر گورنر جنرل ص ۳)

میں پوچھنا چاہتا ہوں ارباب بصیرت سے کہ سیکورٹیٹ کا مدعی کیا اس قسم کے نظریات پیش کرے گا؟ اس موضوع پر کہنے کو تو ابھی بہت کچھ اور بھی کہا جاسکتا ہے اور میں گزشتہ تیس سال سے اس پر لکھتا چلا آ رہا ہوں..... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں جاتے جاتے البتہ ایک اور تأسف کا اظہار بھی ناگزیر ہے۔ محترم جسٹس فرماتے ہیں کہ

قائد اعظم نے آئیڈیالوجی آف پاکستان (نظریہ پاکستان) کے الفاظ کبھی استعمال نہیں کئے تھے۔ تشکیل پاکستان کے پندرہ سال بعد تک بھی کوئی شخص ان الفاظ سے واقف نہیں تھا۔ (ص ۲۸)

قائد اعظم پاکستان کے اسلامک سٹیٹ ہونے کے متعلق جو کچھ دس سال تک کہتے رہے اس کے بعد اس کی چنداں اہمیت نہیں رہتی کہ انہوں نے اس خاص اصطلاح نظریہ پاکستان کو استعمال کیا تھا یا نہیں، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ انہوں نے ان الفاظ کو بھی استعمال کیا تھا۔ مثلاً انہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس امریکہ کے نمائندے کو ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو انٹرویو دیتے ہوئے جہاں یہ کہا کہ

پاکستان ایک مسلم سٹیٹ ہوگی

وہاں نظریہ پاکستان THEORY OF PAKISTAN کے الفاظ بھی استعمال کئے تھے۔

(تقریر قائد اعظم، جلد دوم، صفحہ ۳۲۷-۳۲۶)

پھر انہوں نے ۱۸ جون ۱۹۴۵ء کو فریڈرک مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے نام اپنے ایک پیغام میں کہا تھا:-  
پاکستان سے صرف حریت اور آزادی مراد نہیں، اس سے فی الحقیقت مراد مسلم آئیڈیالوجی

ہے جس کا تحفظ ضروری ہے۔ (تقاریر قائد اعظم، جلد دوم، صفحہ ۲۶۲)

علاوہ ازیں انہوں نے اسلامک آئیڈیالز قسم کے الفاظ متعدد بار استعمال کئے تھے۔ باقی رہا تشکیل پاکستان کے بعد پندرہ سال کا عرصہ، تو اگرچہ اس سوال کا قائد اعظم کی ذات سے کوئی تعلق نہیں لیکن اگر کوئی دیکھنا چاہے تو کم از کم طلوع اسلام کے فائل ہی دیکھ لے جس میں "اسلامی آئیڈیالوجی" و نظریہ پاکستان پر تفصیلی بحث موجود ہے۔

۰

جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں، ان تصریحات سے میرا مقصد اس نقصان کے ازالہ کی حسب استطاعت کوشش ہے جو پاکستان اور بانی پاکستان کے خلاف اس قسم کے پروپیگنڈا کے ذریعے پہنچایا جا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری یہ تنہا اور نحیف سی آواز اس شور و شغب کی کما حقہ حریف نہیں ہو سکتی جو اس مقصد کے لئے ملک کے گوشے گوشے میں برپا کیا جا رہا ہے۔ لیکن مجھے تو بہر حال اپنا فریضہ ادا کرنا ہے۔ یہ پروپیگنڈا کتنے وسیع پیمانے پر عام کیا جا رہا ہے، اس کا اندازہ ذیل کے ایک خط سے لگائیے جو حال ہی میں مجھے طلوع اسلام کے ایک قاری کی طرف سے موصول ہوا ہے :-

ہفتہ وار الفتح کراچی، شماره ۲۸، ستمبر (۱۸-۱۱) ۱۹۸۰ء میں ص ۲ پر ایک مراسلہ زیر عنوان -  
قائد اعظم، کیسا نظام حکومت چاہتے تھے۔ نظر سے گزرا۔ اس کی نقل بعینہ درج دیل  
ہے۔

ممتاز سیاسی رہنما عبدالرحمن صدیقی (مرحوم) ناقل ہیں کہ "تقسیم ہند سے چند روز قبل نئی دہلی نمبر ۱ اورنگ زیب روڈ کا واقعہ ہے کہ ڈنر کی میز پر راجہ صاحب محمود آبادی نے قائد اعظم سے دریافت کیا "پاکستان کا نظام حکومت کیا ہوگا؟" قائد اعظم نے پوچھا۔ آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیے؟ راجہ صاحب نے جواب دیا۔ اسلامی اور ملت کا سب سے زیادہ دیندار متقی، عالم باعمل، صالح ترین شخص کو ہمیشہ ملک کا سربراہ بنایا جائے۔"

قائد اعظم نے کہا، "تم بیسویں صدی میں قرون وسطیٰ کے حالات کا تصور کر رہے ہو۔  
پاکستان میں سیکولر جمہوریت قائم ہوگی۔"

راجہ صاحب بولے: "سر! میں نے اتنے برس مسلم لیگ کی جدوجہد محض ایک اسلامی مملکت اور اسلامی آئین کے نصب العین کو سامنے رکھ کر کی تھی۔ کون سے اسلام کا؟ اسلام میں بہتر فرقے ہیں: قائد اعظم نے دریافت کیا۔ راجہ صاحب خاموش ہو گئے۔ (کار جہاں دراز ہے، جلد دوم، صفحہ ۲۶۱-۲۶۲ از قرۃ العین حیدر)

اس وقت نہ عبدالرحمن صدیقی و نیایں موجود ہیں نہ راجہ صاحب محمود آباد اور نہ قائد اعظم محترمہ قرۃ العین حیدر بھارت فرار ہو چکی ہیں اور وہاں جا کر انہوں نے لکھا تھا کہ وہ خود دقومی نظریے پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ اب فرمائیے کہ ہمارے پاس ڈنر کے میز پر اس ٹیبل ٹاک کی تصدیق کا کون سا ذریعہ ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کو مسخ ہی اس قسم کی روایات کی رُو سے کیا جاتا ہے۔ اسی لئے میں نے شروع میں کہا تھا کہ قائد اعظم (یا کسی اور) کی طرف ان کی صرف ان باتوں کو منسوب کرنا چاہیے جو ان کی زندگی میں محفوظ ہو گئی ہوں۔ اس قسم کی وضعی روایات ہی نے تو ہمیں تباہ کیا ہے۔ مندرجہ بالا ایک روایت ان تمام مجلدات کو غرقاب کر دینے کے لئے کافی ہے جو قائد اعظم کی تقاریر، بیانات، خطابات سے بھر پور ہیں۔ افسانہ ہمیشہ حقیقت سے زیادہ دلکش اور موثر ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے تیس پاروں میں اپنی جامع تعلیمات کو مکمل کرنے کے بعد جن الفاظ پر اس کتاب عظیم کا اختتام کیا ہے وہ دوسرا انگریزی کے شر سے پناہ مانگنے کی دعا ہے۔ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ (۱۱۴/۴)۔ افسانے و سوسہ انگریزی کا بڑا کامیاب حربہ ہوتے ہیں۔ ان سے افراد ہی نہیں قوموں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ پاکستان کو تباہ کرنے کے لئے بیس سال سے افسانہ طرازی کی یہ کوششیں جاری ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ پاکستان ہندوؤں کی تنگ نظری کی وجہ سے وجود میں آیا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کے محرکات سب معاشی تھے۔ گراچی کے ایک پروفیسر قمر الدین خان صاحب دس قدم آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں اسلامی مملکت یا سیاسی نظام کا اشارہ تک نہیں ملتا اور انبیاء کرام صرف پرستش کے طور طریقے سکھانے کے لئے آیا کرتے تھے۔ انہوں نے سرے سے ٹنٹا ہی ختم کر دیا۔ (ان کا یہ مقالہ روزنامہ ڈان کے اس ضمیمہ میں چھپا تھا جو اگست ۱۹۸۰ء کے یوم آزادی کی تقریب پر شائع ہوا تھا)۔

یہ ہے وہ پروپیگنڈا جو آجکل بڑی شدت و حد سے جاری ہے۔ ہم اس باب میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ اس خطہ زمین کو اپنی حفاظت میں رکھے جسے ہم نے "مسجد" تعبیر کرنے کے لئے حاصل

کیا تھا اس میں شبہ نہیں کہ اس پر ابھی تک "مسجد" تعمیر نہیں ہو سکی اور جنہوں نے اس کی تعمیر کے لئے اس خطہ کے حصول کے لئے تگ و تاز کی تھی اور ان میں سے جو "اس کے غبار کارواں کی طرح" ہنوز زندہ ہیں، وہ اپنے اسی حسین خواب کی تعبیر کے انتظار کے سہارے جی رہے ہیں۔ لیکن اگر (خدا نہ کرے) یہ خطہ زمین ہی محفوظ نہ رہا تو "تعمیر مسجد" کا امکان ہی ختم ہو جائے گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بچے کی بانسری! اور یہی ان پاکستان دشمن کوششوں کا مقصود ہے۔

اس مقالہ کے شائع ہونے کے بعد مجھے ملک اور بیرون ملک کے دور دراز گوشوں سے خطوط موصول ہوئے جن میں کہا گیا کہ جن حقائق کا میں نے انکشاف کیا ہے وہ ان کے علم میں پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ملک کے ذرائع ابلاغ (پریس) نے میرے خیالات کے گرد جو حصار کھینچ رکھا ہے، اس مقالہ کی (نوائے وقت) میں اشاعت سے اس میں شکاف پڑا اور اس طرح میرے خیالات، طلوع اسلام کے حلقہ سے باہر دور دراز خطوں تک پہنچ گئے۔ ان خطوط میں ایک مطالبہ بطور قدر مشترک سامنے آتا ہے۔ ان میں کہا گیا ہے کہ میں ذرا وضاحت سے بتاؤں کہ تھیا کریسی، سیکولرازم اور اسلامی مملکت میں کیا فرق ہے؟ میں ان موضوعات پر پاکستان میں (گذشتہ تیس سال سے کھتا چلا آ رہا ہوں۔ لیکن چونکہ یہ مطالبہ ان گوشوں سے موصول ہوا ہے جن تک (اغلباً) اس سے پہلے میرے خیالات نہیں پہنچے اس لئے میں مختصر الفاظ میں اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

تھیا کریسی کا تصور تو پرانا ہے۔ لیکن اسے بطور نظام حکومت، عیسائی کلیسا (چرچ) نے یورپ میں رائج کیا۔ عیسائیت میں حکومت کا تصور تک نہیں۔ نہ ہی (مروجہ) انجیل میں قوانین دیئے گئے ہیں۔ اس لئے عیسائی پادریوں کی حیثیت مشنریوں (مبلغین) سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ جب بعض بادشاہوں نے عیسائیت قبول کی تو پادریوں کے دل میں بھی جذبہ اقتدار پرستی نے انگڑائی لی۔ انہوں نے بادشاہوں سے سمجھوتہ کیا کہ احکام و قوانین کلیسا (چرچ) وضع کرے لیکن وہ نافذ حکومت کی طرف سے ہوں اور یہ سارا کاروبار خدا کے نام پر ہو۔ یعنی ان احکام و قوانین کو احکام خداوندی کہہ کر پکارا جائے اور انہیں نافذ کرنے والے حکمرانوں کو شریعت خداوندی کے محافظ قرار دیا جائے۔ اس سے ایک طرف مذہبی پیشوائیت کے جذبہ اقتدار کی تسکین کا سامان فراہم ہو گیا اور دوسری طرف حکمرانوں کو مقبولیت عامہ حاصل ہو گئی کیونکہ

عوام مذہب پرست تھے اور مذہب کے محافظان کے نزدیک خدائی اختیارات اور الوہیاتی احترام و تقدیس کے حامل (انگلستان کے بادشاہ یا ملکہ کو آج تک

DEFENDER OF THE FAITH

کہہ کر پکارا جاتا ہے)۔ مذہب اور حکومت کی اس ملی بھگت کو تھیا کریسی (یعنی حکومت خداوندی) سے تعبیر کیا گیا۔ اس نظام حکومت میں انسانیت ظلم و استبداد کے جس جہنم میں مبتلا رہی، اس کے تصور تک سے (ہمارا آپ کا ہی نہیں) بلا کو اور چنگیز خاں تک کا کلیجہ دہل جاتا ہے۔ نوع انسان کی تاریخ میں تھیا کریسی سے بدتر دور کبھی نہیں آیا۔ بلا کو اور چنگیز خاں کے دل میں شاید کبھی کھٹک پیدا ہو جاتی ہو کہ ہم بے گناہوں پر کیوں ظلم کر رہے ہیں۔ لیکن جو ظلم و تشدد خدا کے نام پر برپا کیا جائے اس سے تو ظالم اور مستبد حکمران اطمینان ہی نہیں فخر محسوس کرتا ہے کہ میں خدائی مشن پورا کر رہا ہوں۔

مختصر الفاظ میں تھیا کریسی سے مراد ہے ایسا نظام حکومت جس میں انسانوں کے وضع کردہ احکام و قوانین کو احکام خداوندی کہہ کر نافذ کیا جاتے اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو مرتد قرار دے کر حوالہ دار و رسن کر دیا جائے۔ ان مظالم کی بنا پر تھیا کریسی کے خلاف جو ردِ عمل ہوا اسے سیکولر ازم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نظام کے حامیوں نے کہا کہ مذہب کو مملکت اور حکومت سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ مذہب کا دائرہ گرجا کی چار دیواری تک محدود ہے۔ مملکت کے معاملات، قوم کی منشا کے مطابق، کسی قسم کی حدود و قیود کے بغیر، آزاوانہ طے پا جائیں گے۔ انہوں نے مذہب کے لبادہ کے ساتھ اخلاقی اقدار و اصول کی "صدری" کو کبھی اتار کر ڈور پھینک دیا۔ یہ ہے سیکولر نظام حکومت جس میں قانون سازی کے کئی اختیارات کسی قسم کی حدود و شرائط کے بغیر قوم (انسانوں) کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ نظام حکومت (کم و بیش) ساری دنیا میں رائج ہے اور ساری دنیا اس کے ہاتھوں نالاں کھی ہے۔ جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی تو انہوں نے دیکھا کہ اس ملک کے باشندے سخت قسم کے مذہب پرست واقعہ ہوئے ہیں۔ اس بنا پر انہوں نے سوچا کہ یہاں یورپ کی شکل کی سیکولر ازم چل نہیں سکے گی۔ انہوں نے اس میں یہ ترمیم کی کہ قوانین کو دو حصوں میں تقسیم

۱۔ اس کی وضاحت میں نے اپنے اس مقالہ میں کی ہے جس کا عنوان ہے "اسلامی نظام حکومت نہ مغربی جمہوریت ہے نہ شخصی حکومت"

کردیا۔ ایک شخصی قوانین PERSONAL LAWS اور دوسرے ملکی قوانین PUBLIC LAWS

انہوں نے کہا کہ شخصی قوانین کی حد تک ہر شخص کو آزادی ہوگی کہ وہ اپنے عقیدہ اور مسلک کے مطابق ان کا اتباع کرے۔ لیکن پبلک لاز میں مذہب کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یعنی انہوں نے پرسنل لاز کی حد تک تھیا کریسی رائج کر دی اور پبلک لاز کے لئے سیکولرازم ہمارے مذہب پرست طبقہ نے اسے مذہبی آزادی سے تعبیر کیا اور اس کے لئے سلطنت انگلشیہ کا بے حد شکر گزار ہوا۔ تحریک پاکستان کے دوران یہی موقف (ہندوؤں اور) نیشنلسٹ علماء کا تھا اور اسی کو ساتھ لے کر وہ پاکستان آئے۔ ان کے برعکس اقبال اور قائد اعظم نے اسلامی مملکت کا تصور اور مطالبہ پیش کیا۔

اسلامی مملکت میں حق حکومت نہ مذہبی پیشوائیت کو حاصل ہوتا ہے نہ ملک کے دیگر باشندوں کو۔ یعنی وہ تھیا کریسی، سیکولرازم یا انگریزوں کی وضع کردہ تھیا کریسی + سیکولرازم سب کے خلاف ہوتی ہے۔ اس میں حق حکومت خدا کی کتاب (قرآن مجید) کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں وہ اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں جو ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ مملکت کا فریضہ ان اصول و اقدار کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔ ان کی تنفیذ کے طور طریقے قوم (امت) کے باہمی مشورہ سے طے کئے جاتے ہیں۔ انہیں آپ جسزنی قوانین کہہ لیجئے۔ شرط اس میں بھی یہ ہوتی ہے کہ یہ قرآن کے کسی اصول و اقدار سے ٹکرائیں نہیں۔ ان میں پبلک لاز اور پرسنل لاز کی کوئی تفریق اور تمیز نہیں ہوتی۔ پبلک لاز کی طرح ان سب کا اطلاق ملک کے تمام مسلم باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ یہ قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ اور قرآنی اصول و اقدار (جنہیں حدود اللہ کہہ لیجئے) ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ اس مشاورت کی عملی شکل کیا ہوگی، اسے بھی امت باہمی مشورہ سے (مندرجہ بالا شرط کے تحت) خود طے کرے گی۔

یہیں اسلامی مملکت کے نمایاں خط و خال۔ قرآن کریم نے یہ نص صریح کہہ دیا ہے کہ اس کے سوا جو نظام حکومت بھی ہے، وہ کافرانہ نظام ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔ (۵/۴۴)

لے اس کی وضاحت میرے اس پمفلٹ میں ملے گی جس کا عنوان ہے "تلوار سے تیز اور بال سے باریک! اسلامی قانون سازی کا فریضہ۔"

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ جو چیز اسلامی نظامِ مملکت کو غیر اسلامی نظام سے متمیز اور ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کے اختیارات ان اصولِ اقدارِ خداوندی سے مشروط اور ان کے تابع ہوتے ہیں جنہیں حدودِ اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ حدود منزل من اللہ ہوتے ہیں اور ابدی اور غیر تبدیل۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو متعدد مقامات میں دہرایا ہے۔ سورۃ الانعام میں ہے:-

..... تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۗ لَا مُبَدِّلَ

لِكَلِمَتِهِ ۗ ..... ۵ (۶/۱۱۶)

تیرے رب کے اصول و قوانین صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ اب انہیں کوئی اختیار تبدیل نہیں کر سکتی۔ (نیز ۶/۳۳ و ۱۸/۲۷)۔

سورۃ یونس میں ہے: "لَا تُبَدِّلُ رِكْمَتِ اللَّهِ" (۱۰/۶۳) "قوانین و حدودِ خداوندی میں تغیر و تبدیل نہیں ہو سکتا" اس کے برعکس دنیا کے ہر نظام میں (خواہ وہ ملوکیت ہو خواہ آمریت اور خواہ مغرب کی جمہوریت) قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ یہی بنیادی تخصیصِ اسلامی اور غیر اسلامی نظام میں ماہ الامتیاز ہے (سیکولر نظام کے حامیوں کی طرح) جسٹس منیر صاحب غیر تبدیل اصول و حدود کو نہیں مانتے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۷۵ء کے پاکستان ٹائمز میں ان کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا:-

قانونِ تغیر ایک فطری اصول ہے جو تمام کائنات کو محیط ہے۔ ایک ذرہ یا چیز سے لیکر بڑے سے بڑے کرۂ فلکی تک حرکت اور تغیر کی حالت میں مستقلاً سرگرداں ہیں۔ ہم بھی جو اس عظیم کائنات کے ایک ذرے سے گوشے کے مکین ہیں، اسی قانونِ تغیر کے زیرِ اقتدار زندگی بسر کرتے ہیں۔ (ہمارے) اس بیان کی صداقت کے لئے آپ گزشتہ تاریخ پر نظر ڈالئے۔

شیکسپیر نے کہا تھا:-

خیر اور شر فی ذاتہ کچھ نہیں۔ یہ ہمارا زاویہ نگاہ ہے جو کسی بات کو خیر قرار دیتا ہے، کسی کو شر۔ جیسا ہم خیال کریں وہ شے ویسی ہو جاتی ہے۔ حق اور باطل، غلط اور صحیح

قانونی نہیں بلکہ اخلاقی نقطہ نگاہ سے۔۔۔۔۔ اضافی ہیں۔ اسی طرح خیر اور شر بھی۔ انسان کا تصور حق و باطل اور خیر و شر سوسائٹی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جیسے اس بات کا فیصلہ کہ فحش اور بے حیائی کیا ہے، سوسائٹی کے معیار کی رو سے ہوتا ہے۔ انسان اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے جو ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ بجز اس کے کہ کوئی بڑی مہیب قوت اسے روکے رکھے۔۔۔۔۔ اور جس سوسائٹی اور مملکت میں انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تغیرات کو نگاہ میں رکھے۔ مذہب پرست طبقہ البتہ غیر متبدل اقدار پر ایمان رکھتا ہے۔

طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت بابت مارچ ۱۹۷۵ء میں اس پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا تھا:۔  
یہ خیالات اسلام کے پیش کردہ تصورِ حیات کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیر دیتے ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ہم اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام تو ایک طرف، نظامِ فطرت کے متعلق بھی محترم مقالہ نگار کی معلومات بھی بڑی سطحی اور ناقص ہیں۔ وہ اگر کسی عام سائنس دان سے بھی پوچھ لیتے تو وہ بتا دیتا کہ یہ کارگہ کائنات، فطرت کے غیر متبدل قوانین کے تابع سرگرم عمل ہے اور تغیرات صرف ان قوانین کے مظاہر ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ خزاں کے موسم میں درختوں کے پتے جھڑ جانے ہیں۔ سرمایوں وہ بالکل ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر بہار آتی ہے تو ان میں شگفتہ و شاداب تازہ پتیاں اُبھرتی ہیں۔ غنچے چمکتے ہیں۔ پھول کھلتے ہیں۔ پھل آتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک غیر متبدل قانونِ نشوونما کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر ان قوانینِ فطرت میں جس کی بنیادوں پر اس میٹرِ العقول کارگہ کائنات کی عمارت استوار ہے، ذرا سا تغیر بھی آجائے تو سارا سلسلہ کائنات تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ خود منیر صاحب اپنی طبیعی زندگی پر غور فرمائیں۔ زندگی کا مدار تنفس (سانس لینے) کے قانون پر ہے۔ کیا ان کی ساری عمر میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس قانونِ حیات میں تغیر واقع ہوا ہے؟ وہ غالباً اسے "تغیر" سمجھتے ہیں کہ عام حالات میں انسان از خود فضا میں سانس لیتا ہے۔





جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے، تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقعہ ہوئی ہے یکسر جامد و متصتب بن کر رہ جائے گی۔

منیر صاحب نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں کہ انسان کی تمدنی زندگی میں غیر متبدل کا کوئی تصور نہیں، علامہ اقبالؒ کا مندرجہ بالا بیان پیش فرمایا ہے۔ اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے کہ

سخن شناس نہ، دلبر اخطا اینجاست

جس طرح وہ نظام فطرت کے متعلق اتنا نہیں سمجھ سکے تھے کہ اس میں کس قدر غیر متبدل قوانین کار فرما ہیں، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ اقبالؒ کا بیان ان کی تائید نہیں کر رہا، تردید کر رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ ثبات و تغیر کے امتزاج کو اصول حیات قرار دے رہے ہیں۔ وہ غیر متبدل قوانین کو وہ سہارا قرار دیتے ہیں جس پر انسانی زندگی کا قیام ہے۔ لیکن جس طرح محترم جسٹس منیر نے قائد اعظمؒ کے بیانات نقل کرتے ہوئے، ان کے ان حصوں کو حذف کر دیا تھا جو ان کے خلاف جاتے تھے، اسی طرح انہوں نے خطبات اقبالؒ میں سے صرف مندرجہ بالا اقتباس درج کیا تھا اور اس سے اگلی سطریں حذف کر دی تھیں۔ کیونکہ وہ بدیہی طور پر ان کے مسلک کی تردید کرتی تھیں۔ علامہ نے لکھا تھا:-

یورپ کو اپنی عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصول حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں، اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے اس بیان میں سیکولر ازم اور تھیواکریسی دونوں کا ابطال کر دیا ہے۔ سیکولر ازم کا یہ کہہ کر کہ یورپ کی تباہی کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس غیر متبدل اصول حیات نہیں اور تھیواکریسی کا یہ کہہ کر کہ مسلمانوں نے صدیوں پہلے کے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل قرار دے کر انہیں مقام الوہیت عطا کر رکھا ہے۔ یہ دونوں مسالک خلاف اسلام ہیں اور قوموں کی تباہی کا موجب۔

جس نے سیکولرازم کے اپنے عقیدہ کی تائید میں پہلے قائد اعظمؒ کا ہمارا لینا چاہا اور اس میں ناکام رہے پھر علامہ اقبالؒ کو ساتھ ملا چاہا تو وہ بھی جواب دے گئے۔

فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِنْ

تُصْرِيحٍ ۝ (۱۶/۳۷)

جو خدا کی رہنمائی کو چھوڑ کر غلط روش اختیار کرنے اُسے کوئی حامی و ناصر نہیں مل سکتا۔

وَالسَّلَامُ



گر تو می خواہی مسلمان زیستن

نیست ممکن جز بقراں زیستن

(اقبالؒ)

# دوقومی نظریہ

## اقبال اور قائدِ اعظم کی نگاہوں میں

میرے سابقہ مقالہ میں ضمناً دوقومی نظریہ کا بھی ذکر آ گیا تھا، لیکن چونکہ میرے زیر نظر موضوع دوسرا تھا اس لئے میں اُسے چھوٹا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ اس مقالہ کی اشاعت کے بعد مجھے متعدد خطوط موصول ہوئے جن میں کہا گیا کہ جس طرح میں نے اسلامک سٹیٹ اور سیکولر سٹیٹ کے فرق کو نکھارا اور اُبھارا کر بیان کیا ہے اور اس باب میں قائدِ اعظم کے خیالات کو شرح و بسط سے پیش کیا ہے، اسی طرح "دوقومی نظریہ" کے متعلق بھی مجھے تفصیل سے لکھنا چاہیے اور اس باب میں علامہ اقبال اور قائدِ اعظم کے نظریات اور مسلک کو وضاحت سے بیان کرنا چاہیے۔ یہ سطور اسی مطالبہ کی تکمیل میں تحریر ہیں۔

جب اس کثرۃ ارض پر انسانوں نے پہلے پہل مل جل کر رہنا شروع کیا تو وہ (مختصر ہی سہی) الامحالہ ایک جماعت، ایک گروہ، ایک معاشرہ تھا جس میں کسی قسم کی تفریق اور تقسیم نہیں تھی۔ اس کے بعد ان میں تفریق پیدا ہوئی شروع ہوئی۔ قرآن کریم کے الفاظ میں:

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا... (۱۰/۱۹)

ابتدا میں نوع انسان ایک ہی اُمت تھی۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔

ان اختلافات کو مٹا کر انسانوں کو پھر سے اُمتِ واحدہ بنانے کے لئے انبیاء کرام کا سلسلہ شروع

ہوا ارشاد ہے:-

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً قَفْ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيْنَ مُبَشِّرِيْنَ  
وَ مُنذِرِيْنَ ۝ وَ أَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُحْكَمَ  
بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اِخْتَلَفُوْا فِيْهِ ... ۝ (۲/۲۱۳)

نوع انسان شروع میں ایک ہی امت کے افراد تھے پھر ان میں اختلافات پیدا  
ہونے شروع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے مبشرین اور منذرین انبیاء کرام کا سلسلہ  
شروع کیا اور ان کے ساتھ ضابطہ قوانین بھی نازل کیا تاکہ وہ اس کے ذریعہ  
ان کے اختلافات کو مٹا کر (انہیں پھر سے امت واحد بنا دیں)۔

نوع انسان کی امت واحدہ سب سے پہلے خاندانوں میں تقسیم ہوئی۔ خاندان بڑھے تو اس  
تفریق نے قبائل کی شکل اختیار کر لی۔ قبائل دامن و راز ہوتے تو نسلی امتیازات کی تفریق پیدا ہو گئی۔  
اور اب اس دور میں اس تقسیم نے قومیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس تفریق کے لئے کرۃ ارض پر  
لکیریں کھینچی گئیں اور ان سے مختلف ممالک وجود میں آ گئے اور ایک ملک کی چار دیواری کے اندر  
بسنے والے انسان ایک قوم کے افراد قرار پائے۔ اس طرح خدا کی وسیع و عریض زمین مختلف ملکوں  
کی حدود میں بٹ گئی اور انسانوں کی عالمگیر برادری نے متعدد قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ اب  
کوئی انسان محض انسان ہونے کی نسبت سے پہچانا نہیں جاتا۔ وہ متعارف ہوتا ہے وطن یا قوم کی  
نسبت سے۔ اس سے دنیا کس قدر عالمگیر جہنم کے عذاب میں مبتلا ہے اس کا اندازہ اس چیخ و  
پکار سے لگ سکتا ہے جو دنیا (بالخصوص مغرب کے دانشکدوں) سے مسلسل اٹھ رہی ہے (یہ  
بہر حال دوسرا موضوع ہے)۔ آپ نے دیکھا کہ یہ تفریق، خون، رنگ، نسل، زبان، وطن کی بنیادوں  
پر پیدا ہوئی۔ حضرات انبیاء کرام نے (وحی خداوندی کی رو سے) کہا کہ یہ معیار تفریق باطل ہے حقیقی  
معیار تقسیم، فکر و نظر (آئیڈیالوجی) کی ہم آہنگی ہے۔ زندگی کا ایک تصور مستقل اقدار خداوندی کی  
رو سے متشکل ہوتا ہے۔ جو لوگ اس تصور حیات میں ہم آہنگ ہوں، وہ رنگ، نسل، زبان اور  
وطن کے اختلاف کے باوجود ایک برادری کے افراد ہیں۔ جو اس تصور کو تسلیم نہ کریں وہ دوسری  
برادری کے افراد۔ قرآن کریم میں ہے:-

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ... ۵ (۲/۲۴)

خدا نے تم سب کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے ایک گروہ نے بلند عالمگیر انسانیت کی زندگی سے انکار کر دیا، دوسرے گروہ نے اسے تسلیم کر لیا۔

اور یوں نوع انسان دو گروہوں میں بٹ گئی۔ بلند سطح زندگی سے انکار کرنے والوں کو اصطلاح میں کافر کہتے ہیں۔ حقیقی زندگی کے تسلیم کرنے والوں کو مومن۔ کافر کے معنی انکار کرنے والا ہیں اور مومن کے معنی مان لینے والا۔ قرآن کریم کی رو سے تفریق انسانیت کا یہی معیار ہے جس کے مطابق دنیا میں دو ہی قومیں بستی ہیں، مومن اور کافر یا مسلم اور غیر مسلم۔

حضرات انبیاء کرام نے اس معیار تفریق کو محض نظری طور پر پیش نہیں کیا۔ اپنی زندگی میں اس پر عمل پیرا ہو کر دکھا بھی دیا۔ سلسلہ وحی کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ جب ان کے زمانے میں ان کی اپنی قوم میں اس معیار کے مطابق تفریق پیدا ہوئی تو حضرت نوح ایک طرف تھے اور ان کا حقیقی بیٹا دوسری طرف، کیونکہ وہ مبنی بروحی نظریہ حیات میں ان سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اسی طرح جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ نے اس صحیح روش زندگی کو اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو آپ نے نہ صرف باپ سے بلکہ پوری قوم سے یہ کہہ کر قطع تعلق کر لیا کہ

وَاعْتَصِرْ لَكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ... ۵ (۲۸/۱۹)

میں تم سے اور جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان سب سے الگ ہوتا ہوں۔

اور اتنا ہی نہیں بلکہ ان سے کہہ دیا کہ

إِنَّا بُرَاءٌ لَكُمْ وَمِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ

ہم تم سے اور ان سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو، ان سب سے بچ کر تعلق نہیں۔

کَفَرْنَا بِكُمْ "ہم تم سے ہر رشتے کا انکار کرتے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں" وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا "تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی کھلی عداوت اور نفرت رہے گی" اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو اور یہ عداوت محبت سے اور یہ

نفرت، رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر یقین کر لو جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے، حَتَّىٰ تَوْتَمِنُوا بِاللَّهِ وَحَدًّا (۶۰/۴) اس لئے کہ اس عالمگیر اصولِ زندگی کی رُو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار، خون یا وطن کا رشتہ نہیں معیار یہ ہے کہ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي... (۱۲/۳۶) جو شخص میرے پیچھے چلتا چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو) وہ میرے اپنوں میں سے ہے اور میرے "اپنے" جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہیں وہ میرے غیر ہیں۔ یہی تھا وہ معیار جس کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ بھی اپنوں میں سے نہیں بلکہ غیروں میں سے تھی، اس لئے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوا (۱۰-۱۱/۶۶)۔ قومیت کی تقسیم و تفریق کا یہی معیار تھا جو نوعِ انسانی کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا آیا تاکہ دنیا کے سامنے وہ دور آگیا جب وحی کی تکمیل ہو گئی اور اس کے مطابق نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں، ایک ایسی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے ساری دنیا پر روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا کہ قومیت کا صحیح معیار کیا ہے۔

## قومِ رسولِ ہاشمی

اس تشکیلِ قومیت کے مطابق حبش کا بلال، فارس کا سلمان اور روم کا صہیب (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) محمدؐ عربی کی "اپنی قوم" کے افراد تھے اور مکہ کا ابو جہل اور (حقیقی چچا) ابولہب "غیر قوم" کے افراد۔ قومیت کی اس تقسیم کا عملی مظاہرہ بدر کے میدان میں نکھر کر سامنے آگیا۔ جب آسمان کی آنکھ نے یہ نظارہ دیکھا کہ حضرت ابو جہرہؓ ایک طرف تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف، حضرت حذیفہؓ ادھر تھے تو ان کا باپ عقبہ دوسری طرف، حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کا ماموں اس طرف، حضرت علیؓ ادھر تھے تو ان کا بھائی عقبیل ادھر نہیں! اور آگے بڑھتے، ادھر خود محمدؐ تھے تو ان کے مد مقابل آپ کے حقیقی چچا عباس اور داماد ابوالعاص۔ یہ تھی وہ تقسیمِ انسانیت جو وطن، رنگ، زبان، نسل، رشتہ داری کے تمام حدود و شغور سے بلند ہو کر خالص ایمان اور کفر کے معیار پر وجود میں آئی تھی۔ یہ تھی وہ امتِ محمدیہؐ وہ ملتِ اسلامیہ، وہ جماعتِ مومنین جو دنیا کے مختلف حصوں کے ان انسانوں پر مشتمل تھی جن میں وجہ اشتراک صرف ایمان تھا۔ یہی تھی وہ تقسیم جس کے متعلق کہہ دیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد:

بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۝ (۸/۷۲) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں نہ ماننے والوں (کفار) کی قوم: بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۸/۷۳) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز۔" اس کے بعد اس قوم مومنین کو تاکید کر دی کہ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً رِجَالًا مِنْ دُونِكُمْ۔

اے جماعت مومنین! تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔ اس لئے کہ لَا يَأْتُونَكُمْ نَجَبًا ۝ "یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔" وَذُوَا مَا عَنِتُّمْ ۝.... "ان کی ولی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں اُلجھے رہو۔" قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۝ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۝ ان کے بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آجاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ۝ (۳/۱۱۷) ہم نے تمہیں واضح طور پر ان امور سے آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لو گے (تو زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے)۔ ان نہ ماننے والوں کی حالت یہ ہے کہ إِنْ تَمَسَسْكُمُ حَسَنَةٌ تَسُومُوهَا ۝ "اگر کوئی بات تمہاری بھلائی کی ہوتی ہے تو اس سے انہیں سخت رنج پہنچتا ہے" وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۝.... (۳/۱۱۹) اور اگر تمہیں کچھ نقصان پہنچتا ہے تو یہ چیز ان کے لئے بڑی خوشی کا موجب ہوتی ہے۔

یہ بے قرآن کی تعلیم مسلم اور غیر مسلم کے باہمی تعلقات کی بابت۔ پھر چونکہ یہ قوم (مومنین) خانقاہ نشین راہبوں کی جماعت یا تارک الدنیا زادوں کا گروہ نہیں تھی، بلکہ وہ قوم تھی جس کے دین کے منکمن ہونے کے لئے حکومت لائیفک تھی (دیکھئے ۲۳/۵۵) اس لئے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ تم نے اپنی حکومت میں تمام فیصلے احکام خداوندی کے مطابق کرنے ہیں۔ فَا حُكْمٌ بَيْنَهُمْ رِجَالًا أَنْزَلَ اللَّهُ ۝.... (۵/۴۸) جو ایسا نہیں کرے گا وہ مومن نہیں کافر

۱۔ عدم گنجائش کے باعث یہاں صرف انہی آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے مزید آیات کے لئے دیکھئے۔



ہے (۵/۲۴)۔ قرآن کریم کے ان اصولوں کی روشنی میں تمہیں جو فرعی قوانین مرتب کرنے پڑیں، انہیں آپس میں ایک دوسرے کے مشورے سے طے کیا کرو: **وَ اَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** (۲۲/۳۸) ان میں کسی غیر کو شریک نہ کیا کرو۔ جو ان مستقل اقدار کی صداقت پر یقین ہی نہیں رکھتا وہ تمہارے امور مملکت میں شریک و ذخیل کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آپ کو نہ رسول اللہ کی مجالس شوریٰ میں کوئی غیر مومن دکھائی دے گا، نہ خلفائے راشدین کی پارلیمنٹ میں کوئی غیر مسلم۔ ان کی حکومت خالصتہً جماعت مومنین پر مشتمل تھی اور غیر مسلم اس مملکت میں ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہتے تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے سر پر تھی۔ وہ "قوم مسلم" کے افراد نہیں تھے۔

## صدرِ اول کے بعد

اسلام کے صدرِ اول کے بعد جب دین، مذہب میں بدل گیا تو اس کے دیگر مہماتِ اصول کی طرح قومیت کا یہ نظریہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور مسلمان بھی دیگر قوموں کی طرح نسل اور وطن کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ گئے۔ صدیوں سے ہماری یہی حالت چلی آ رہی تھی کہ ہم میں اقبال جیسا مفکر پیدا ہو گیا جس نے اپنی قرآنی بصیرت کی رُو سے (دین کی دیگر اساسات کی طرح) اس فراموش کردہ حقیقت کی بھی از سر نو یاد دہانی کرائی کہ امتِ محمدیہ کانسوں اور وطنوں کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ جانا، اسلام کی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے۔ یہ پوری امتِ ایمان کے اشتراک کی بنا پر امتِ واحدہ ہے۔ فکرِ اقبال کے عام ہو جانے کی وجہ سے آج ہمارے لئے یہ سمجھنا کہ سلامی قومیت کا یہی معیار ہے، چنداں تعجب انگیز نہیں، لیکن خود اقبال کا اس قرآنی حقیقت تک پہنچنا بڑا تعجب انگیز تھا۔ وہ ۱۹۰۵ء میں (جب اس کی عمر تیس تیس سال سے زیادہ نہ تھی) حصولِ تعلیم کے لئے یورپ گیا اور تین سال تک وہاں رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقوامِ یورپ میں نیشنلزم کی مدح و ستائش کے غلغلے بلند ہو رہے تھے۔ (دانا یان مغرب اس نظام نو کو نوعِ انسان کی مشکلات کا رادہ قرار دے رہے تھے۔ چاروں طرف سے اس کی بارگاہ میں تبریک و تہنیت کے تحائف پیش کئے جا رہے تھے۔ ان حالات میں ایک ایسے نوجوان طالب علم کو جو پہلے ہی سے نیشنلزم سے متاثر ذہن لے کر یورپ گیا ہو، متشدد نیشنلسٹ ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن مورخ کی نگاہ یہ دیکھ

کر جو حیرت رہ جاتی ہے کہ اس طالب علم کے قلب و نگاہ میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ وہ  
گیا تھا تو یہ کہتے ہوئے کہ ے

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

اور واپس آیا تو یہ گاتا ہوا کہ ے

چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا مسلم میں ہم وطن سے سارا جہاں ہمارا

وہ گیا تھا تو یہ گنگنا تا ہوا کہ ے

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!

اور واپس آیا تو یہ الاپتا ہوا کہ ے

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیر میں اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وہ گیا تھا تو یہ سندیش دیتا ہوا کہ ے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور آیا تو یہ اعلان کرتا ہوا کہ ے

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

چونکہ یہ نظریہ اسلامی نظامِ زندگی کی اصل و بنیاد تھا، اس لئے علامہ نے اس کی تبلیغ کو اپنی زندگی  
کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اسے کس شد و مد سے پیش کرتے تھے، اس کا اندازہ اس نظم سے لگائیے جو

بانگِ در میں "وطنیت" کے عنوان سے درج ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں ے

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساتی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیر میں اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیبِ نبوی ہے غارتگر کا شانہ دینِ نبوی ہے

بازو ترا تو حید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیں ہے، تو مصطفویٰ ہے

نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!  
اے مصطفویٰ! خاک میں اس بُت کو ملا دے

## اس نظریہ کی مخالفت

میں نے اپنے سابقہ مقالہ میں بتایا ہے کہ جب قائدِ اعظم نے سیکولر سٹیٹ کے خلاف اسلامی مملکت کا نظریہ پیش کیا تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت نیشنلسٹ علماء کی طرف سے ہوئی تھی۔ اسی طرح اقبالؒ کے پیش کردہ نظریہ قومیت کی شدید ترین مخالفت بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ اس کا ٹیپ کا بند ان کی وہ بحث ہے جو (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ ہوئی۔

شروع ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ مولانا مرحوم نے دہلی کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔  
”قونینتیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں“۔ ہندوستان کے سب سے بڑے دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کی طرف سے اس قسم کا اعلان، کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کیا جاسکتا۔ علامہ اقبالؒ اس زمانے میں یوں کہتے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے جب انہوں نے اس خلاف اسلام نعرہ کو سنا تو ان کے دل صدچاک سے ایک آہ اُبھری جو ان الفاظ کی شکل میں، فضا کو چیرتی ہوئی آں سوئے افلاک تک جا پہنچی کہ

عجم ہنوز نداندر موزِ دیں ورنہ زدیوبند حسین احمد میں چہ بواجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بمصطفیٰ برسائِ خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بادِ نرسیدی تمام بولہبی است

ان اشعار میں ”بمصطفیٰ برسائِ خویش را“ کے الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی اور ایک عظیم حقیقت کے عکاس ہیں۔ دین، خدا کی طرف سے ملتا ہے، لیکن امت کی تشکیل اس رسول کی نسبت سے ہوتی ہے جو اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا اور اس کے مطابق ایک معاشرہ تشکیل کرتا ہے۔ اسی نسبت سے اسلام کے پیرو، امتِ محمدیہ کہلاتے ہیں۔ اگر قومیت کی اساس وطن یا نسل قرار پاجائے تو رسول اللہ

سے نسبت ختم ہو جاتی ہے اور جب رسولؐ سے نسبت منقطع ہو جائے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔

إِنَّ الَّذِينَ فَتَرُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا سِتِيْعًا لَّسْتُ مِنْهُمْ فِي  
شَيْءٍ ۗ (۶/۱۵۹)

جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور اس طرح الگ الگ فرقے، پارٹیاں  
قویں بن جائیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

یعنی اگر قومیت کی اساس اسلام کی طرف نسبت کے بجائے کوئی اور قرار دے لی جائے تو ایسے  
لوگوں کا رسولؐ سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ اقبالؒ نے کہا کہ وطن کو قومیت کی اساس  
قرار دینے سے رسولؐ اللہ سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو اپنی قومیت  
نسبت، وطن کے بجائے حضور نبیؐ اکرمؐ کی طرف کرو۔ مصطفیٰ برسائے خویش را کہ دیں ہمہ اوست  
اگر باؤ ز سیدی۔۔۔۔۔ اگر تم نے اپنی نسبت حضورؐ کی طرف نہ کی تو۔۔۔۔۔ تمام  
بولہبی است۔۔۔۔۔ پھر وہی باقی نہیں رہتا، بولہبی رہ جاتی ہے جس میں قومیت کی نسبت  
وطن یا نسل کی طرف کی جاتی ہے۔ اس اصولی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہؒ نے کہا تھا:

اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی قابلِ قدر اور اہم تھا تو رسولؐ اللہ کے بعض اقارب،  
ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرغاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسولؐ اللہ نے  
اسلام کو ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت، اوجہل اور ابولہب کو اپنا  
رکھا اور ان کی دیکھتی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان  
کے ساتھ قومیت و وطنی قائم رکھی۔۔۔۔۔ محمدؐ (ذوالابی و امی) کی قوم آپ کی  
بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی لیکن جب محمدؐ کی امت متبعت بننے لگی تو اب  
قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسولؐ اللہ کی متابعت میں آگئے وہ خواہ ان  
کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے، وہ سب امتِ مسلمہ یا ملتِ محمدیہ بن گئے  
پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے اب "ملک و نسب" ان کا گرفتار ہو گیا۔

کسے کو پنچہ زو ملک و نسب را      نہ داند نکتہ دین عرب را  
اگر قوم از وطن بوئے محمدؐ      نداد سے دعوت دین بولہب را

حضور رسالت آتب کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ بولہب یا بوجہل یا کفارہ  
مکہ سے فرماتے کہ تم اپنی بُت پرستی پر قائم رہو، ہم خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر  
اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے، ایک  
وحدتِ عربیہ قائم کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر حضور (نعوذ باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو اس  
میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی، نبی آخر الزماں کی راہ نہ ہوتی۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبال نے اپنے اس بیان میں اسلامی نظریہ قومیت کو کس قدر اُبھار کر  
اور نکھار کر بیان کر دیا ہے۔ لیکن ابھی اس نظریہ کا ایک رُخ باقی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا  
ہوں، دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے، لیکن امت کی تشکیل اس نبی کی طرف نسبت ہوتی ہے جس  
کی دسات سے وہ دین ہم تک پہنچتا ہے میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی متعدد بار واضح کر چکا  
ہوں، لیکن موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسے آج پھر دہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ امت کی تشکیل  
اس رسول کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جسے سلسلہ انبیاء کی آخری کڑی تسلیم کیا جائے مثلاً ایک  
عیسائی، حضرت عیسیٰ اور ان سے پہلے کے جملہ انبیائے نبی اسرائیل پر ایمان رکھتا ہے، لیکن چونکہ وہ  
حضرت عیسیٰ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتا ہے۔ یعنی نبوت کو حضرت عیسیٰ کی ذات پر ختم قرار دیتا  
ہے، اس لئے وہ امتِ حضرت عیسیٰ کا فرد (یعنی عیسائی) کہلاتا ہے۔ لیکن جو نبی وہ حضرت عیسیٰ کے بعد  
ایک اور نبی (یعنی محمد رسول اللہ) پر ایمان لے آتا ہے، وہ امتِ عیسوی سے کٹ کر ایک نئی امت،  
یعنی امتِ محمدیہ کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی اصول کی رُو سے، اگر کوئی شخص، محمد رسول اللہ کے بعد کسی اور  
نبی پر ایمان لے آتا ہے تو وہ امتِ محمدیہ سے کٹ کر ایک نئی امت کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ علامہ اقبال  
نے اپنے بیان میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا تھا کہ جس طرح رسول اللہ کے بعد کسی کو نبی تسلیم  
کرنے والے کا رشتہ، امتِ محمدیہ سے کٹ جاتا ہے، اسی طرح وطن یا نسل کو قومیت کی اساس  
قرار دینے سے بھی امتِ محمدیہ کے ساتھ رشتہ باقی نہیں رہتا۔ انہوں نے کہا کہ:-

حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریہ وطنیت  
ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں "انکارِ خاتمیت" کا نظریہ  
وطنیت کے حامی بالفاظِ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت

کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الہی ابد الابد تک متعین و متشکل کر چکا ہے، کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایک راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے، بعینہ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی اُمتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وطن یا نسل کی بنیادوں پر قومیت کا تصور ذاتِ رسالتِ آتب سے رشتہ منقطع کر کے ایک جدید اُمت یا نئے دین کو وجود میں لانے کے مرادف بن جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی تہنید اس قدر واضح تھی کہ اس کے بعد مولانا مدنی (مرحوم) اور ان کے ساتھ دیگر نیشنلسٹ علماء کو نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیے تھا بلکہ نیشنلزم کا مسلک بھی ترک کر دینا چاہیے تھا لیکن اس کے بجائے مولانا مدنیؒ نے اپنے دعویٰ کی مدافعت میں لمبا چوڑا بیان داغ دیا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے وہ بیان شائع کیا جو ”معرکہ دین و وطن“ کے نام سے مشہور ہے اور جو اسلام کی قومیت کے مسئلہ پر ناقابل تردید حقائق کی تابندہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ ان کے اس معرکہ آرا بیان کو یہاں درج کر دیا جائے، لیکن عدم گنجائش اس سے مانع ہے۔ (ویسے میں اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہوں)۔

(ضمناً) مولانا مدنی (مرحوم) کے متبعین میں سے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے اس بیان کے بعد مولانا مدنی نے یہ وضاحت کر دی تھی کہ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار وطنیت ہے۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ آجکل قومیتیں، وطنیت کی بنا پر متشکل ہوتی ہیں اور علامہ اقبالؒ نے ان کی اس معذرت (یا وضاحت) کو قبول کر لیا تھا، اس لئے اس قصہ کو اب دہرانا نہیں چاہیے۔ لیکن یہ حضرات اس حقیقت کو سامنے نہیں لاتے کہ مولانا مدنی (مرحوم) نے حضرت علامہ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں کہا تھا کہ اقبالؒ کا موقف منہی برحقیقت نہیں تھا۔ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار وطنیت ہی ہے۔ طلوعِ اسلام نے اسی زمانے میں اس

کتابچہ کا بھرپور جواب شائع کیا تھا جس کا کسی سے آج تک جواب نہیں بن پڑا۔ (یہ مقالہ بارڈیگر، طلوع اسلام بابت جولائی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا)۔

علامہ اقبالؒ عمر بھر اسلام کی اس بنیادی حقیقت کو پیش کرتے رہے، لیکن یہ احساس ان کے دل میں برابر کھٹک پیدا کر رہا تھا کہ ان کے بعد ہندوستان کی سیاست میں ان نظریات کو عملی طور پر کون آگے بڑھائے گا؟ جب آنے والا مورخ اس حقیقت پر نگاہ ڈالے گا کہ اس مقصد کے لئے ان کی نگہ انتخاب کہاں جا کر ٹکی تو وہ یقیناً محو حیرت رہ جائے گا۔ ان کی نگاہ کا ہدف تھا مسٹر محمد علی جناحؒ۔ وہ جناحؒ جو عمر بھر نیشنلسٹ رہا اور پھر ہندوستانی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر لندن کے گوشہ خلوت میں جا بیٹھا تھا۔ اس قسم کے نیشنلسٹ کو اسلامی قومیت کے نظریہ کا ایسا معتقد بنا دینا کہ وہ اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دے لئے اقبالؒ کا وہ کارنامہ ہے جس سے ملت اسلامیہ ان کی ہمیشہ رہیں منت رہے گی۔ یہ کیسے ہوا تھا، اس حقیقت کی پردہ کشائی قائد اعظمؒ کے سوانح حیات کا انگریز مرتب (میکسٹر ولیمسٹون) ان الفاظ میں کرتا ہے۔

اپنے قیام لندن کے دوران مسٹر جناحؒ نے اقبالؒ سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے۔ لیکن اس کے باوجود جناحؒ نے اقبالؒ کے دلائل کو فوری طور پر تسلیم نہیں کیا۔ اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا۔

(صفحہ ۹۹)

جناحؒ انگلستان گیا تھا تو اس نیشنلسٹ کا پرستار جس کی شہادت آج بھی بمبئی میں ”جناح کانگریس ہال“ دے رہا ہے اور واپس آیا تو اقبالؒ کا یہ پیغام دہراتا ہوا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر  
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی  
ان کی جمعیت کا ہے ملکِ نسب پر انحصار  
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں

اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

قائد اعظمؒ نے اسلام کے اس تصورِ قومیت کو کس کس انداز سے پیش کیا اس کی مثالیں آگے چل کر

سامنے آئیں گی۔ لیکن میں سب سے پہلے ان کا ایک ایسا فقرہ پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے پوری تفصیل کو اس طرح سمٹا کر رکھ دیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ انہوں نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا:-

پاکستان کا آغاز اس دن ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں ہنوز مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

بات کس قدر واضح ہے کہ جب یہاں پہلی بار ایک غیر مسلم، اسلام لے آیا تو اس ملک میں دو قوموں کا وجود عمل میں آ گیا اور یہی پاکستان کی بنیاد ہے۔

انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے، ایڈورڈس کالج پشاور میں ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو کہا تھا:-

ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے، ہمارا دین، ہمیں ایک ایسا ضابطہ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

جداگانہ قومیت کا یہی وہ تصور تھا جس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے اس شد و مد کے ساتھ ہوئی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبہ صدارت میں (مارچ ۱۹۳۷ء میں) کہا تھا کہ

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور دو قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا تھا:-

مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرداز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔



جب قائد اعظم نے اس تصور قومیت پر بار بار زور دیا تو مسٹر گاندھی نے انہیں (مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۴۴ء) ایک خط میں لکھا:-

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آبا و اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں وہ اپنے آبا و اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

مسٹر گاندھی کا یہ خط یوں سمجھئے کہ قائد اعظم کے اس خط کے جواب میں تھا جس میں انہوں نے مسٹر گاندھی کو لکھا تھا کہ

اس باب میں مجھے نہ کسی قسم کا دھوکا ہے نہ شک و شبہ کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ملک ایک ہے۔ یہ برصغیر مختلف اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کون سی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح ہے تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے..... لہذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں) آج انسانی سعی و کوشش کا دائرہ ایک ناقابل تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی سیاسی معاشی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے جس مذہب کو نوع انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں۔ میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت

ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(جناح کا خط بنام گاندھی، جنوری ۱۹۴۰ء)

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۴۰ء تحریک پاکستان کی تاریخ میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں پاکستان کا ریزولوشن پاس ہوا تھا۔ اس اجلاس کے خطبہٴ صدارت میں قائد اعظم نے فرمایا تھا:-

میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھتے، ہندو اور مسلمان، مذہب کے ہر معاملہ میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دونوں الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ مملکت میں یک جا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

اس کے ایک سال بعد انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اس کے خطبہٴ صدارت میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا:-

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات یا ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔

قائد اعظم نے اس دعویٰ کو اس شدت سے دہرایا کہ ان کے مخالفین تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک ممتاز رکن

مسٹر این. سی. دست نے اپنے ابنائے قوم کے نام ایک کھلی چٹھی میں جو اخبار "مدینہ" بجنور کی یکم فروری ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی، لکھا تھا۔

ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناح نے مال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ یہ میرے خیال میں اب نہیں، توکل حقیقت ہو کر رہے گا..... میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ البتہ اس میں ترمیم و اصلاح کر کے، اسے اپنے حسب حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اور اس حقیقت کو بالآخر ہندو اور انگریز دونوں کو تسلیم کرنا پڑا۔ اور دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان وجود میں آگیا۔ اس موضوع پر قائد اعظم کی تقاریر اور بیانات سے اور کبھی بہت کچھ پیش کیا جاسکتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ انہی اقتباسات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کے خیالات اس قدر صاف اور واضح تھے کہ اس باب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ تشکیل پاکستان کے بعد بھی وہ کس طرح اس حقیقت کو دہراتے رہے، اسے ذرا آگے چل کر پیش کیا جائے گا۔

میں نے اپنے دوسرے مقالہ میں کہا ہے کہ تقسیم ہند اور تشکیل پاکستان کے مخالفین، قائد اعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کو ٹرپ کے پتے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قائد اعظم نے تو اسلامی مملکت کے قائل تھے اور نہ ہی مسلمانوں کی الگ قومیت کے مؤید۔ وہ وطن کی بنیادوں پر قومیت کے قائل تھے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں (محولہ بالا تقریر کے ضمن میں) اسلامی مملکت کے مسئلہ پر تو وضاحت سے بحث کی تھی، لیکن نظریہ قومیت کے سلسلے میں صرف اتنا کہا تھا کہ اس سے ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ "مسلمان اور غیر مسلم" اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم بن جائیں گے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ غیر مسلم یہاں اقلیت کی حیثیت سے رہیں گے اور اسی حیثیت سے ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔

اس نکتہ کی مزید وضاحت ضروری ہے۔

## غیر مسلم اقلیتیں

انہوں نے (۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی محولہ بالا تقریر سے قریب ایک ماہ پہلے) ۱۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے دہلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا تھا۔ اس میں ان حسب پاکستان میں اقلیتوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:-

میں ان وعدوں سے جو میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کئے ہیں، منحرف نہیں ہوں گا۔ میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کہا ہے کہ انہیں پورا پورا تحفظ حاصل ہوگا۔ میں جو کبھی کہتا ہوں اس کا وہی مفہوم ہوتا ہے۔ اور جو کچھ میں کہہ چکا ہوں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اقلیتوں کو خواہ وہ کسی جماعت اور کسی فرقے سے متعلق ہوں پورے پوری طرح تحفظ دیا جائے گا۔ ان کو اپنی مذہبی رسومات و عبادت کی پوری آزادی ہوگی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ ان کی جان، ان کے مال اور ان کے تمدن کی پوری حفاظت کی جائے گی اور انہیں بلا تفریق مذہب و ملت رنگ ہر صورت میں پاکستان کا باشندہ تصور کیا جائے گا۔

(بحوالہ نولے وقت، مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۷۸ء)

آپ نے دیکھا کہ قائد اعظم نے اس میں، پاکستان کے غیر مسلموں کو اقلیتیں کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ان کی ۱۱ اگست کی تقریر کے ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد انہوں نے (اس تقریر کے تین ہی دن بعد) ۱۳ اگست کو مجلس آئین ساز کا افتتاح کیا۔ لارڈ داؤنٹ بیٹن نے ۱۱ اگست کے بعد اپنی تقریر میں یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے امید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے ویسا ہی کشادہ ظرفی اور رواداری کا سلوک کیا جائے گا جیسا شہنشاہ اکبر نے کیا تھا۔ قائد اعظم نے داؤنٹ بیٹن کے اس مشورہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس مذہبی رواداری اور حسن سلوک کا ثبوت دیا وہ ہمارے ہاں کوئی بعد کا وضع کردہ مسلک نہیں تھا۔ وہ مسلک ہمارے ہاں تیرہ سو

سال پہلے سے چلا آ رہا تھا جب حضور نبی کریمؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل کر لینے کے بعد ان سے لفظاً ہی نہیں بلکہ عملاً انتہائی رواداری برتی اور ان کے مذہب اور عقائد کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا۔ مسلمانوں کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انہوں نے جہاں جہاں بھی حکومت کی (غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کے) اپنی عظیم انسانیت ساز اصولوں پر عمل کیا اور انہی پر ہمیں بھی عمل کرنا چاہیے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائد اعظمؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہوگی؟ اس ضمن میں آپ اس نکتہ پر بھی غور فرمائیے کہ حضور نبی اکرمؐ نے جن یہودیوں اور عیسائیوں سے حسن سلوک کا برتاؤ کیا تھا، وہ مسلم قوم کا جزو نہیں بن گئے تھے۔ اسلامی مملکت میں ان کی حیثیت ذمیوں کی تھی۔ یہ حقیقت بجائے خویش اسلامی نقطہ نگاہ سے "دوقومی نظریہ" کا بین ثبوت ہے اس کے بعد قائد اعظمؒ قریب ایک سال تک زندہ رہے اور اس دوران میں انہوں نے بہت سے مواقع پر تقاریر کیں اور بیانات دیئے جہاں جہاں بھی موقع ملا انہوں نے غیر مسلموں کو ہمیشہ اقلیت کہہ کر پکارا اور انہیں یقین دلایا کہ یہاں ان سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے گا۔ مثلاً انہوں نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو خاق دینا ہال کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

ایک اور سوال جو میرے دل میں بار بار ابھرتا ہے اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ میں نے جلوت اور خلوت میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں اقلیتوں سے حسن سلوک کا ثبوت دینا چاہیے۔ تقسیم ہند کے وقت اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ لہذا جب تک اقلیتیں مملکت کی وفادار رہیں گی انہیں یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔

پھر انہوں نے ۲۳ اکتوبر کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

اسلام ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے ہمسائیوں اور اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کرے خواہ ان کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے اس کے باوجود ہمیں یہاں کی اقلیتوں کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیے۔

اور ان کے دل میں اس حفاظت کی طرف سے، کامل اعتماد پیدا کرنا چاہیے ہمارا یہی رویہ ہمارے لئے باعثِ عزت اور وجہِ افتخار ہونا چاہیے۔

۳ فروری ۱۹۴۸ء کو سندھ کے پارسیوں نے قائدِ اعظم کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ "حکومت اس امر کا خاص اہتمام کر رہی ہے کہ اقلیتوں کے دل سے خوف اور بد اعتمادی کے تمام شبہات کا ازالہ کر دے" انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا۔

اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم دوسرے اہل مذہب کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیں۔ جو لوگ بھی یہاں برضا و رغبت ہم سے تعاون کریں گے ہم ان کے اس تعاون کا گرم جوشی سے استقبال کریں گے۔

انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہر غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہم نے اپنی انتہائی مشکلات کے اس زمانہ میں اپنی اقلیتوں کی جس قدر حفاظت کی ہے اور ان کا جتنا خیال رکھا ہے، ہندوستان میں اُس کی کہیں مثال نہیں مل سکتی۔ میں اس موقع پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کریں گے۔ پاکستان میں ان کی جان اور مال کی حفاظت..... ہندوستانی اقلیتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت ہمارا ذمہ ہے اور ہم اس ذمہ داری کو مذہب و ملت کی تیز سے بلند ہو کر پورا کرتے رہیں گے۔

اس کے بعد انہوں نے اسی تقریر کے دوران فرمایا۔

اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے \_\_\_\_\_ اور آپ مجھ سے شفق ہوں گے کہ یہ ایک عظیم سبق ہے جو اس نے ہمیں سکھایا ہے کہ آپ کچھ بھی ہوں، اول و آخر آپ مسلمان ہیں اور ایک قوم کے افراد ہیں، تم نے اپنے لئے ایک وسیع مملکت تراشی ہے۔ یہ مملکت آپ سب کی مشترکہ ملکیت ہے۔ یہ نہ پنجابی کی ہے نہ بنگالی کی نہ سندھی کی ہے نہ پٹھان کی۔ یہ آپ سب کی ہے..... اس لئے اگر

تم ایک قوم بننا چاہتے ہو تو خدا کے لئے صوبائی تفریق کے خیال کو جھٹک دیجئے۔  
صوبائی تفریق ایک لعنت ہے۔ ویسی ہی لعنت جیسی لعنت فرقہ بندی، شیعہ  
ستی کی تفریق ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے فرمایا:-

میں اس موقع پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ جم پاکستان میں اقلیتوں کے  
ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں گے۔

آپ نے دیکھا کہ اس تقریر کے پہلے اقتباس میں انہوں نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں  
"ایک قوم" کہا ہے اور دوسرے اقتباس میں غیر مسلموں کو اقلیتیں" فرمایا ہے کہ ایسا کہنے والا  
"دو قومی نظریہ" کا علمبردار تھا یا متحدہ قومیت کا؟

انہوں نے ۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

ایک غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان  
نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ کہیں بہتر سلوک کیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے درمیان نہ صرف  
امن و اطمینان سے رہ رہی ہیں بلکہ انہیں اپنے قدم جانے کی بھی پوری آزادی

حاصل ہے۔

۱۳ جون ۱۹۴۸ء کو ٹیٹہ کے پارسیوں کے ایک وفد نے قائد اعظم کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو

اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ

آپ کو معلوم ہے کہ میری اور میری حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ پاکستان میں بلاتمیز

مذہب و ملت اور بلحاظ رنگ و نسل ہر شخص کی جان، مال اور عزت کی پوری پوری

حفاظت کی جائے گی۔ اقلیتوں کو اس باب میں بالکل مطمئن رہنا چاہیے۔

آپ نے دیکھا کہ قائد اعظم اس تمام دوران میں پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو اقلیت کہہ کر

پکارتے رہے اور انہیں ان کی جان، مال اور عزت، آبرو کی حفاظت کا یقین دلاتے رہے۔ انہوں نے

کہیں ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں مل کر ایک قوم بن چکے ہیں، اس لئے

اب ان میں کسی قسم کی تفریق و تمیز باقی نہیں رہی۔ اس کے برعکس وہ اس حقیقت کا اعادہ کرتے

۱۹۴۸ء  
 رہے کہ مسلمان اپنے مخصوص نظریہ زندگی کی بنا پر ایک الگ قوم بنتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹ فروری  
 کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے اس براڈ کاسٹ میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے  
 کہا کہ

یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو  
 ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے افراد ہیں جس میں حقوق، شرف و احترام اور  
 تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنا بریں ہم میں وحدت اور  
 اخوت کا بڑا گہرا اور خاص جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات  
 ہم اپنے نظریات زندگی، نقطہ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں جو قومیت کی  
 تشکیل کا مدار بنتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائد اعظم نے قومیت کی تشکیل کے لئے کون کون سے اجزاء کو لاینفک قرار دیا؟  
 کیا یہ وہی اجزاء نہیں جن کے امتزاج سے مسلم قوم یا امت مسلمہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ قائد اعظم نے  
 کہیں بھی یہ کہا تھا کہ ہم (پاکستان کے مسلم اور غیر مسلم) اشتراک وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن چکے ہیں؟  
 پھر انہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو مملکت پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنے اس پیغام  
 میں جو ان کی زندگی کا آخری پیغام تھا پاکستان کو دنیا کی سب سے بڑی مسلم سٹیٹ کہا کر پکارا۔ یہ  
 پہلا موقع نہیں تھا کہ انہوں نے اسے "مسلم سٹیٹ" کہا ہو۔ اس سے پہلے بھی انہوں نے اسے بہر  
 موقع پر مسلم سٹیٹ ہی قرار دیا تھا۔

ہم پوچھتے ہیں دنیا بھر کے ماہرین سیاست سے کہ جو مملکت وطنیت کی بنیادوں پر استوار  
 ہوئی ہو اسے کبھی بھی "مسلم سٹیٹ" ہندو سٹیٹ یا عیسائی سٹیٹ کہا جاسکتا ہے؟ یاد رہے کہ وطنیت  
 کی بنیادوں پر مختلف آئیڈیالوجی رکھنے والوں کے امتزاج سے جو قوم متشکل ہوئی ہو اس کی مملکت  
 ہمیشہ سیکولر ہوتی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ اس بحث کے سلسلہ میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے  
 علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ

اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور



کے بچارہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تولادینی ہوگا اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی

نظام سے بے پروا ہی۔

لہذا قائدِ اعظم کا مملکتِ پاکستان کو مسلم سٹیٹ کہنا خود اس امر کی شہادت ہے کہ وہ متحدہ قومیت کے قائل نہیں تھے۔

## نئی نسل کی تعلیم

یہ تھے دو قومی نظریہ کے متعلق قائدِ اعظم کے خیالات میں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد ملک کے اربابِ حل و عقد کی خدمت میں گزارش کیا تھا کہ مذہب (دین) کی بنیادوں پر ایک مملکت اور ایک جداگانہ قومیت کا تصور دنیا میں رائج نظریاتِ سیاست کے خلاف اور انوکھے نظریات ہیں۔ ہم (پرانی نسل کے افراد) تو وہاں سے یہ کچھ پکارتے ہوئے یہاں آگئے ہیں، لیکن ہماری نئی نسل کی سمجھ میں یہ بات از خود نہیں آسکے گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم کا انتظام ایسا کیا جائے کہ یہ نظریاتِ علی و جبہ البصیرت ان کی زندگی کا جزو بن جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارا نوجوانِ تعلیم یافتہ طبقہ عام نظریاتِ سیاست سے متاثر ہو کر سیکولر سٹیٹ اور وطنی قومیت کا قائل ہو جائے گا اور اس سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کی وجہ جواز ہی ختم ہو جائے گی۔ ان حضرات نے میری ان گزارشات پر کوئی توجہ نہ دی۔ نتیجہ یہ کہ یہ زہرِ ہماری نئی نسل کے رگِ دپے میں سرایت کرتا گیا۔ ملک میں موجود پاکستان دشمن عناصر اس زہرِ آلودہ خون کی گردش کو تیز سے تیز تر کرتے چلے گئے اور اس کا عملی مظاہرہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل میں ہوا۔ تعلیم کی طرف سے ہماری بھرانہ تغافلِ شعاری کی وجہ سے وہاں کے طالب علموں کی ذہنیت کیا بن چکی تھی، اس کا اندازہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے (اس زمانے کے) ایم اے فائنل کے ایک طالب علم عزیز الرحمن کے اس خط سے لگ سکتا ہے جو روزنامہ

DAINIC PAKISTAN

۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ ہم سے جو کہا جاتا ہے کہ ہم مذہب کی بنا پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں تو اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ

ہم شہری چیتنیا، خودی رام، سہاس بوس، بیجائے سنگھ، جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالد طارق، موسیٰ اور علی جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا یعنی اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا۔ ہم اپنے بچوں کے نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر رکھ گئے اور ناگنی، کھاگنی جیسے سیدھے سادے ناموں کو تیاگ دیا۔

اس کے بعد اس نے لکھا تھا:-

اب ہمارا جنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داسر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب اور وجوہات معلوم کرنے کے لئے ہم تحقیقاتی کمیشن بھٹاتے رہے، لیکن یہ سب بے سود تھا۔ اس کا بنیادی سبب وہ ذہنیت تھی جس کی جھلک عزیز الرحمن کے مندرجہ بالا خط میں صاف نظر آ رہی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد سقوطِ ڈھاکہ کے جگر خراش المیہ پر شادیا نے بجائے ہوئے بنگلہ دیش کے اس وقت کے قائم مقام صدر مسٹر نذیر الاسلام نے اعلان فرمایا تھا کہ

ہماری یہ فتح نہ کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی، یہ فتح ہے حق کی باطل پر، یہ فتح ہے، ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر، تقسیم ہند سے پہلے سر پھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے، سیکولر نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل، اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے، لیکن چوبیس

سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوط ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں ورنہ جو شتر مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا۔ حقائق کسی کے جھٹلائے جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔

## مسز اندرا گاندھی

ادھر نذر الاسلام صاحب یہ کہہ رہے تھے اور دوسری طرف (اس زمانے کی بھارت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اپنی پارلیمنٹ میں جشن "فتح بنگالہ" پر ہدیہ تبریک کے جواب میں یہ فرمایا رہی تھیں کہ

یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی، یہ کامیابی ہے 'حق پر مبنی نظریہ کی' اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے، یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب ۲۵ سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

(سابقہ مشرقی پاکستان) حالیہ بنگلہ دیش میں اس ذہنیت نے ملک کو دو لخت کر دیا۔ ادھر مغربی پاکستان میں اس ذہنیت کی پرورش کے لئے دوسرا انداز اختیار کیا گیا۔ یہاں کہا گیا کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں بلکہ مختلف قومیں آباد ہیں۔

قارئین کو شاید یاد ہو کہ ۱۹۶۸ء میں کراچی کی "عوامی ادبی" انجمن کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع

ہوا تھا جس پر منجملہ دیگر ” دانشوران قوم “ جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا۔

ہمارے نزدیک جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر و تسلط سے آزاد ہو کر خود مختار ترقی کر سکیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔

یعنی سیکولر مملکتوں میں تو وطن کی چار دیواری کے اندر بسنے والے تمام افراد ایک قوم کہلاتے ہیں۔ یہاں ان حضرات نے اس نظریہ کی ترویج شروع کی کہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں بسنے والے الگ الگ قوم ہیں۔ یعنی یہ ” ارباب دانش “ سیکولر سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے اور تقسیم ہند کے سب سے شدید مخالف خان عبدالغفار خان بھی اسی قسم کے نظریات عام کرنے میں برابر مصروف ہیں۔ انہوں نے ۱۹۴۳ء میں ” ٹائمز آف انڈیا “ کے نمائندے مسٹر دلپ کمار کرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ” چند سال پہلے کا پاکستان اب مرچکا ہے۔ مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتہ کی تعمیر کرنی ہوگی۔ “ انہوں نے یہ بات کوئی پہلی مرتبہ نہیں کہی۔ وہ جب ۱۹۶۹ء میں کابل سے بھارت گئے تھے تو انہوں نے وہاں کہا تھا کہ

میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا نہ ہی میں کبھی ایسا کروں گا۔ مذہب قومیت کا معیار کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا رہا ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے۔ جب اسلام یا کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا اس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے۔ ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تو تھی ہی، لہذا میں اسے کس طرح تسلیم کر لوں کہ قومیت کا معیار مذہب ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔

(سٹینسین ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۹ء بحوالہ پاکستان ٹائمز ۲۳/۱۰/۶۹)

ادھر والد بزرگوار یہ فرما رہے تھے اور ادھر ان کے صاحبزادہ خان عبدالولی خان یہ اعلان کر رہے تھے۔  
 دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔  
 پچیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریہ پاکستان غلط تھا۔  
 (نوائے وقت، ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

میں نے پہلے لکھا ہے کہ بنگالی طالب علم 'عزیز الرحمن' نے اپنے خط میں کہا تھا کہ اب وطن پرستی  
 کی ذہنیت مشرقی پاکستان سے آگے بڑھ کر سندھ میں سرایت کر رہی ہے۔ کراچی سے شائع  
 ہونے والے روزنامہ "حریت" کی اشاعت بابت ۳ نومبر ۱۹۶۸ء میں ایک سندھی طالبہ مس نسیم تھل کا  
 ایک خط چھپا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ

وہ اسلام اور پاکستان جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے  
 اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف  
 اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت، سندھ کے  
 سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہنجو دڑو، کوٹ ڈی جان کے آثارِ قدیمہ اور  
 لطیف، سچل، ایاز، جی ایم سید کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم  
 ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے عظیم ہے (نہ کہ اسلام کی وجہ سے)۔

(طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۶۸ء)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد وہاں کے بہاری (یعنی غیر بنگالی) مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی  
 (اور ان پر مصائب و آلام کا جو سلسلہ اب تک جاری ہے) اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سندھ کی  
 ایک اور بیٹی، غزالہ بلوچ کا ایک خط اخبار "ڈیلی نیوز" کراچی کی ۱۹ اگست ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں  
 شائع ہوا تھا جس میں اس نے لکھا تھا۔

اگر مشرقی پاکستان کے بہاری، پاکستانی فوج اور مرکزی حکومت کے بجائے بنگالی  
 علیحدگی پسندوں کی حمایت کرتے تو وہ آج بڑی بڑی پُر مسرت حالت میں ہوتے لیکن  
 انہوں نے سخت حماقت کی اور پاکستان — ایک پاکستان کے ساتھ  
 وفاداری پر اصرار کرتے رہے اور اب اپنی حماقت کی قیمت اپنی اور اپنے بال بچوں

کی جانوں کی شکل میں ادا کر رہے ہیں، بہاریوں کی بد قسمتی دراصل اس دن شروع ہوئی تھی جب انہوں نے ۲۷ - ۱۹۴۶ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے تو آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں رہنے والے بہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پذیر قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں گے۔ (اطلاع اسلام، اکتوبر ۱۹۶۲ء، ص ۲۳)

وہاں کے نوجوان طبقہ میں یہ ذہنیت از خود پیدا نہیں ہو گئی تھی وہاں کے "بزرگ سیاستدانوں" نے جب اپنی گاڑی کا رخ بدلاتا تو اس سے ساری فضا متاثر ہو گئی۔ سندھ کی "بزرگ ترین سیاسی شخصیت" مسٹر جی ایم سید کی تھی۔ وہ مسٹر سید جنہوں نے سب سے پہلے سندھ میں مسلم لیگ کو متعارف کرایا تھا اور بعد میں ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ اوائل ۱۹۶۳ء میں جب ان کی سالگرہ منائی گئی تو اس تقریب پر انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

پاکستان کے موجودہ انتشار، افراتفری اور پسماندگی میں چار عناصر کا ہاتھ ہے۔ یعنی دو قومی نظریہ، مذہبی نظام حکومت کا تختیل، فسطائی نظریہ سیاست اور پڑوسی ملکوں سے دشمنی۔

اس کے بعد انہوں نے مطالبہ کیا کہ

۲۴ سالہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے دو قومی نظریہ کو خیر باد کہا جائے یا پاکستان میں پانچ قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور بنگال کی آزادی کے بعد مغربی پاکستان کی چار قوموں کو ملکی خود مختاری دے کر ان کے باہمی سمجھوتے سے ایک فیڈریشن بنائی جائے۔ (المنبر، ۳ فروری ۱۹۶۲ء)

سندھ سے آگے بڑھ کر بلوچستان کی طرف آئیے۔ وہاں کے (اس زمانے کے) وزیر اعلیٰ سردار عطاء اللہ مینگل نے ۱۹۶۲ء میں کہا تھا کہ

جس دو قومی نظریہ کی اساس پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا وہ خلیج بنگال میں غرق ہو چکا ہے۔  
(نوائے وقت، ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

اور وہاں کے گورنر میر غوث بخش بزنخو نے ملتان کے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا:-

پاکستان میں بسنے والی قومیتوں کی تاریخ، جغرافیائی حدود، تہذیب و ثقافت ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ان کا معاشرہ جدا ہے، ہمارا مطالبہ اتنا ہے کہ ان کے نازک احساسات کا خیال رکھا جائے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ پھر پاکستان کو متحد رکھنے کی کیا اساس ہے۔ انہوں نے کہا کہ چار قومیتوں کے مجموعہ سے ایک پاکستانی قوم بنے گی، جب ہم آپس میں بات کریں گے تو علیحدہ علیحدہ قومیتوں میں ہونگے، جب کسی غیر ملک سے بات ہوگی تو پاکستانی قوم کی بات ہوگی۔

(نوائے وقت، ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ جب سارے ملک میں قومیں الگ الگ ہوں تو پاکستانی قوم کی بات کون کرے گا؟ میں اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے زیر نظر مقصد کے لئے سر درست اتنا ہی کافی ہے (میں مزید تفصیل کسی دوسرے وقت پر لکھتا ہوں)۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ دو قومی نظریہ نہ تو کوئی سیاسی نظریہ ہے اور نہ ہی اسے مطالبہ پاکستان کے لئے سیاسی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ یہ اسی طرح ہمارے دین و اسلام کا تقاضا تھا (اور ہے) جس طرح مسلمانوں کی الگ آزاد مملکت کا وجود اسلام کا تقاضا تھا (اور ہے) ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار نہ صرف پاکستان کی الگ مملکت کی وجہ جواز کو ختم کر دیتا ہے بلکہ اسلام کے ایک بنیادی ستون کو منہدم کر دیتا ہے۔ اس کی یہی دینی اہمیت ہے جس کے لئے علامہ اقبالؒ ساری عمر اس کی نشر و اشاعت کرتے رہے۔ قائد اعظمؒ نے پاکستان کی

لڑائی لڑی اور اب میں اسے گذشتہ تیس سال سے پاکستان میں عام کر رہا ہوں۔ یہی نظریہ وحدت  
 امت کی بنیاد بن سکتا ہے اور وحدت امت اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔  
 والسلام

پرویز

